خیابانِ امیرِ ملّت

مرتّبہ

محمد صادق قصوری

مرکزی مجلسِ امیرِ ملّت برُج کلاں ضلع قصور

خیابانِ امیرِ ملّت

مرتّبہ

محمد صادق قصوری

مرکزی مجلسِ امیرِ ملّت بُرج کلاں ضلع قصور

سلسلہ اشاعت ۲

نام کتاب	خیابانِ امیرِ ملت
مرتب	محمد صادق قصوری
کتابت	مولانا شاہ محمد چشتی سیالوی قصور
بار اول	۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء
مطبع	
تعداد	ایک ہزار
ہدیہ	دعائے خیر بحق معاونین مجلسِ امیرِ ملت

بیرونی حضرات ایک روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر طلب کریں۔

ناشر

مرکزی مجلسِ امیرِ ملت، بُرج کلاں ضلع قصور

جناب غلام محی الدین نقشبندی انوری
جماعتی

فہرست

انتساب		۴
کلمۂ آغاز	مرتب	۵
یہی ہے رختِ سفر	ابوالمنصور سرمدی	۶
امیرِ ملت کے ساتھ ایک دلچسپ سفر	شیخ عبدالشکور لاہوری	۱۸
امیرِ ملت سے ایک ملاقات	حضرتِ شرافت نوشاہی	۳۳
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی	منقول	۳۹
نیل گوٹھی کا مسافر	گل محمد فیضی ایم اے	۴۴
قطعاتِ تاریخ وفاتِ امیرِ ملت	محمد صادق قصوری	۴۷

انتساب

رئیس المحققین امام العاشقین شبیہ امیرِ ملّت عالی جناب جوہرِ ملّت
حضرت پیر سیّد حافظ اختر حسین شاہ مدظلہ، سجادہ نشین
آستانہ عالیہ علی پور شریف ———— اور
شہزادہ بلند اقبال نجم الملّت حضرت صاحبزادہ پیر سیّد
منور حسین شاہ مدظلہ کے نام ————

نگاہِ لطف و کرم کا امیدوار
محمد صادق قصوری

کلمۂ آغاز

"انوارِ امیرِ ملت" کے بعد حسبِ وعدہ "خیابانِ امیرِ ملت" حاضرِ خدمت ہے، اب یہ فیصلہ کرنا قارئینِ کرام کا فرض ہے کہ میں اپنے مشن میں کہاں تک کامیاب و کامران ہوا ہوں۔

انوارِ امیرِ ملت کو عوام و خواص نے جس طرح بنظرِ تحسین دیکھا ہے، اس کے لئے اللہ رب العزت کے حضور سجدہ ریز ہوں کہ اس نے میری اس خدمت کو پذیرائی بخشی، فللہ الحمد۔

خیابانِ امیرِ ملت میں حضرتِ امیرِ ملت پیر سید حافظ جماعت علی شاہ محدث علی پوری قدس سرہ کے متعلق چھ مضامین پیش کئے جا رہے ہیں جن میں حضرت کی مذہبی، ملی، سیاسی اور معاشرتی خدماتِ جلیلہ کا ذکرِ خیر کیا گیا ہے، امید ہے کہ قارئینِ کرام اس مختصر کتاب سے مستفید ہو کر دعائے خیر سے یاد فرمائیں گے۔

اس کتاب کے بعد ہمارے پاس کچھ اور کتابیں منتظرِ طبع ہیں جو وقتاً فوقتاً آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی رہیں گی، لیکن آپ حضرات کے تعاون کے بغیر اس منزل کو طے کرنا نہایت ہی دشوار ہے لہٰذا آپ حضرات مجلسِ امیرِ ملت کے مستقل رکن بن کر مالی تعاون فرمائیں تاکہ ہم اپنا یہ کام جاری رکھ سکیں۔

محمد صادق قصوری
برج کلاں ضلع قصور

۲۸ مارچ ۱۹۸۰ء
جمعۃ المبارکہ



ابو المنصور سرمد

"یہ مضمون پاکستان کے مؤقر جریدے "سب رنگ" کراچی میں شائع ہوا تھا، ہم ماہنامہ سب رنگ کے مدیرِ اعلیٰ محترم شکیل عادل زادہ کی اجازت سے یہ مضمون شائع کر رہے ہیں"

ناشر



بیسویں صدی کا آغاز تھا۔ پسرور کے رہنے والے ایک نوجوان ظفر علی کو ایک لڑکی سے عشق ہو گیا، پہلی نظر کا عشق۔ لڑکی بسنتی ساڑی پہنے ماتھے پر لال بندیا لگائے، بالوں میں چنبیلی کا گجرا سجائے اپنے دروازے پر کھڑی تھی، اُس کے چہرے سے حسن کا رعب و وقار جھلک رہا تھا۔ ظفر علی ایک دین دار گھرانے کا حافظِ قرآن تھا۔ اُس کی تلاوت میں عجب کشش تھی۔ جہاں تک آواز جاتی، لوگ کام کاج چھوڑ کے تلاوت سننے میں محو ہو جاتے ظفر علی من کا موجی تھا۔ آبادی سے دل گھبراتا تو جنگلوں میں نکل جاتا، ہفتوں نہ لوٹتا۔ جب آتا، داڑھی بڑھی ہوتی اور آنکھوں میں ایسا جلال کہ دیکھنے والوں کی نظریں خود بخود جھک جاتیں۔ چند دن ظفر علی جذب کے عالم میں رہتا، کبھی مسجد کی سیڑھیوں پر پڑ جاتا، کبھی رات رات بھر آوارہ گردی کرتا۔ سنسان راتوں میں تنہا گھومتے ہوئے اگر اُسے تلاوت کا خیال آجاتا تو پسرور کی گلیوں میں گناہ کے رقص کرتے گھنگرو تھم جاتے لیکن ظفر علی لوگوں کے کہنے پر کبھی قرآن نہ سناتا۔ اُس کا کہنا تھا "اللہ میاں جب خود اپنی باتیں مجھ سے سننا چاہتے ہیں، سن لیتے ہیں۔ میں صرف اُن کے لیے اُن کو، اُن کی باتیں سناتا ہوں۔ وہ خوش ہوتے ہیں، میں خوش ہوتا ہوں۔ کسی دوسرے کی خوشی ناخوشی سے مجھے کیا لینا۔" کچھ لوگ ظفر علی کو مغرور سمجھتے، بعض کا خیال تھا کہ وہ انگریز سی آئی ڈی کا آدمی ہے، انگریز ایسے لوگوں کو بڑی بڑی تنخواہوں پہ ملازم رکھتے ہیں۔ اُن دنوں پسرور میں فوجی بھرتی ہو رہی تھی۔ لوگ بھرتی کے خلاف آواز اُٹھا رہے تھے۔ ظفر علی کے متعلق انھیں شبہ تھا کہ وہ انگریز کمشنر کو ایسے باغیوں کی فہرست بھیجنے پر مامور ہے۔ شک کرنے والوں کے علاوہ کچھ لوگ ظفر علی کو اللہ کا برگزیدہ بندہ سمجھ کر ہر طرح اُس کی خدمت کرتے مگر ظفر علی ان تمام باتوں سے بے نیاز اپنے آپ میں مگن تھا۔ لوگ حیران تھے کہ اس کی گزر بسر کس طرح ہوتی ہے۔ ظفر علی کبھی ایک خوش پوش نوجوان کے روپ میں بازار بازار خرید و فروخت کرتا، کبھی عام لوگوں سے عام لوگوں کی طرح ملتا جلتا اور کبھی جذب میں خود کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیتا۔ وہ پسرور کی ایک پراسرار شخصیت بن گیا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے۔ ظفر علی ایک مکان کے سامنے سے گزر رہا تھا، معاً کسی نسوانی آواز نے اُسے پکارا "کدھر چلے جی حافظ جی؟"

ظفر علی نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اُس سُندر نار کو دیکھتا رہ گیا۔ مالتی نامی یہ لڑکی اپنے غیر معمولی حسن کے باعث پسرور کے مہم جُو نوجوانوں کے لیے چیلنج بن کر رہ گئی تھی، وہ کسی کو منہ نہ لگاتی، ممکن تھا کہ اُس کی خاطر کئی قتل ہو جاتے لیکن وہ ایک معزز پجاری کی لڑکی تھی ہندو نوجوان پجاری کے تقدس کی بنا پر اُس سے دور رہتے اور مسلم نوجوان اس لیے جھجکتے کہ کہیں یہ معاملہ ہندو مسلم فساد میں نہ بدل جائے۔ لڑکی کو کچھ غرورِ حسن تھا، کچھ اپنے باپ کا طنطنہ۔ وہ آنکھوں میں کاجل لگائے، گردن اُٹھائے گھر سے نکلتی تو اُس کا ناقابلِ تسخیر نظر آنا، اُس کے حسن میں چار چاند لگا دیتا۔ اُس کے نینوں

کے تیروں کو عام اجازت تھی جسے چاہیں مار ڈالیں، جسے چاہیں نیم بسمل کر دیں۔ مالتی کسی نوجوان سے خود کبھی بات نہیں کرتی تھی مگر اُس صبح نہ جانے اُسے کیا ہوا، اُس نے ظفر علی کو پکارا۔ ظفر علی کی آنکھیں مالتی کی آنکھوں سے ملیں، اُسے ایسا محسوس ہوا کہ چہرہ ہیں۔ وہ مالتی کا خوب صورت چہرہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا پھر وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"مالتی!" لڑکی نے اس طرح اپنا نام بتایا جیسے میدان میں کسی کو شکست دے کر فخر سے کہا جائے، مقابلے سے پہلے مدِ مقابل کا قد تو دیکھ لیتے۔

"تم مجھے کیسے جانتی ہو؟" ظفر علی پر عالمِ حیرت طاری تھا۔

"تم راتوں کو بھجن گاتے ہو، وہ مجھے اچھے لگتے ہیں۔" مالتی مسکرائی۔

"بھجن نہیں، قرأت۔ کیا تم قرأت سنو گی؟"

"ہاں، سنوں گی۔"

"کہاں سنو گی؟ یہاں؟"

"ہاں یہیں سنوں گی۔"

اتفاق سے مالتی کا باپ اُدھر نکل آیا۔ اپنی بیٹی کو ظفر علی سے باتیں کرتے دیکھ کر اُسے غصہ آ گیا۔ اس نے بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور اُسے تیزی سے گھسیٹتا ہوا گھر میں لے گیا۔ ظفر علی دیر تک مالتی کے تصور میں وہیں کھڑا رہا۔ کھڑے کھڑے اُس نے سورۂ رحمان کی تلاوت شروع کر دی۔ اُس کے اِرد گرد سامعین جمع ہونے لگے، وہ اتنے محو تھے جیسے خود کلام والے سے کلام سن رہے ہوں۔ اچانک ایک بزرگ وہاں سے گزرے، اُن کے پیچھے بیس پچیس معتقد ہاتھ باندھے چل رہے تھے۔ بزرگ نے مسکرا کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "حافظ جی ذرا دُور نکل گئے ہیں۔ کبھی واپس آئے تو بہت پشیمان ہوں گے۔ قرآن نعوذ باللہ ڈگڈگی نہیں ہے کہ اُسے بجا کر مجمع لگایا جائے۔" یہ کہہ کے بزرگ آگے بڑھ گئے۔ ظفر علی کو کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ کہاں کھڑا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اُسے ہوش آیا تو وہ سینکڑوں آدمیوں میں تماشا بنا کھڑا تھا، اُسے بہت غیرت آئی۔ وہ اسی وقت بستی سے نکل گیا اور مالتی کی یاد میں شہروں شہروں گھومنے لگا۔ مالتی کا چاند ہمیشہ اُس کی نگاہ میں رہتا، وہ جتنا اُسے بھلانا چاہتا، یاد اتنی ہی بڑھ جاتی۔ تلاوت میں بھی وہ مزا نہ ملتا۔ اِس بات سے اُسے اور وحشت ہوتی۔ وہ سوچتا کہ ایک لڑکی کے حُسن نے یہ کیا جادو کر دیا۔ میرا سرمایۂ حیات مجھ سے چھن گیا۔ ظفر علی مالتی کے حصول کی غرض سے دو ایک بار پسرور بھی گیا لیکن مالتی کے رشتے داروں نے اُسے زد و کوب کر کے بستی سے نکال دیا۔ اب ظفر علی

پیروں فقیروں کی طرف متوجہ ہوا۔ شاید گنڈے تعویذ اور دعاؤں سے گوہرِ مراد حاصل ہو جائے۔ اسی تلاش میں ایک روز وہ علی پور سیداں کی خانقاہ پہنچ گیا۔ یہاں وہی بزرگ اپنے عقیدت مندوں کے درمیان بیٹھے تھے، جنھوں نے پسرور میں کہا تھا: "حافظ جی ذرا دُور نکل گئے ہیں۔" انھوں نے مسکرا کر حافظ جی سے پوچھا: "آج اِدھر کیسے نکل آئے؟ تمھاری منزلِ مقصود تو پسرور میں رہتی ہے۔"

ظفر علی بزرگ کے قدموں پر گر پڑے: "حضور! آپ ہی کی تلاش تھی۔ اگر مالتی مجھے نہ ملی تو نہ خدا ملے گا نہ صنم۔"

"تو تمھیں خدا کے بجائے صنم چاہیے؟" بزرگ نے مسکرا کر پوچھا۔

"آپ روشن ضمیر ہیں۔" ظفر علی گڑگڑایا۔ "دعا کیجیے کہ میرا ایمان بھی سلامت رہ جائے اور منزل بھی مل جائے۔"

"قرآن بھی یاد ہے یا سب بھول گئے؟" بزرگ نے سوال کیا۔

"یاد ہے حضرت! یاد ہے۔" ظفر علی نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"خاک یاد نہیں ہے۔" بزرگ کو غصہ آ گیا۔ "اُس دن میں نے سُنا تھا، تم سورۂ رحمان پڑھ رہے تھے۔ سورۂ رحمان تو بڑی چیز ہے کاش تم صرف رحمان یا صرف اللہ اس طرح کہہ سکتے جس طرح کہنے کا حق ہے۔"

ظفر علی لرز اُٹھا: "حضرت! مجھے اللہ کہنا سکھا دیجیے۔"

"اللہ کے لیے یا صنم کے لیے؟" بزرگ نے نرمی سے دریافت کیا۔

"صنم کے لیے۔" ظفر علی نے نظریں جھکا کے جواب دیا۔ "اس کے حُسن میں مجھے اللہ کا حسن نظر آتا ہے۔"

بزرگ نے اپنے عقیدت مندوں کو دیکھا: "صاحبو! یہ تو عاشقِ صادق معلوم ہوتا ہے۔" وہ اشتیاق سے ظفر علی کی طرف متوجہ ہوئے۔ "اچھا حافظ جی! جس طرح ہم اللہ کہیں، اُسی طرح تم کہو۔ دیکھو تمھیں کیا کچھ نہیں ملتا۔" بزرگ نے لفظ اللہ ادا کیا۔ ظفر علی ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔

بہت دیر بعد اُسے ہوش آیا، بزرگ نے پوچھا: "حافظ جی! اب بھی صنم کی یاد باقی ہے یا دوبارہ اللہ کہنا سکھاؤں؟"

ظفر علی نے انتہائی دل سوزی سے اللہ کہا۔ ایک شعلہ سا یکایک بھڑکا اور ظفر علی کا جسم چشم زدن میں خاک ہو کر رہ گیا۔ بزرگ نے آہستہ سے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور بولے: "اللہ کے دروازے سے اللہ کے لیے بندے کا یہ پہلا قدم ہوتا ہے۔ خوش نصیب تھا ظفر علی پہلے ہی قدم میں ناکام نہیں ہوا۔"

ان بزرگ کا نام پیر جماعت علی شاہ تھا مگر وہ امیرِ ملت

کے نام سے مشہور تھے۔ اُن کی پیدائش سے پہلے رسول پور سیداں کے مشہور عالم غلام رسول جمعہ پڑھنے قلعہ سوبھا سنگھ جایا کرتے تھے۔ علی پور سیداں کی حدود شروع ہوتیں تو وہ اپنی جوتیاں سر پر رکھ لیتے، ان کے ہمراہی بھی اپنی اپنی جوتیاں اُتار لیتے۔ غلام رسول ایک کم گو اور کم آمیز عالم تھے، ایک دن وہ علی پور سیداں کی مٹی کو بوسہ دیتے ہوئے بولے: "اس سرزمین پر عنقریب ایک شخص پیدا ہونے والا ہے، اُسے تمام ہندوستان کی قطبیت کا تاج پہنایا جائے گا۔ وہ پورے ملک میں روشنی کی دولت تقسیم کرے گا۔ گھر گھر، ذرہ ذرہ چمک اُٹھے گا۔"

امیرِ ملت کے والد سید کریم شاہ ایک متقی، دین دار اور فیاض آدمی تھے۔ وہ جو بات زبان سے کہتے، پوری ہو جاتی۔ امیرِ ملت کے نانا بھی اپنے زمانے کے کاملین میں سے تھے۔ ایک دن امیرِ ملت گیارہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ گھوڑے پر سوار تحصیل شکر گڑھ جا رہے تھے۔ کھیتوں میں گنے کا رس نکل رہا تھا، بڑے بڑے کڑھاؤ آگ پر رکھے تھے اور راب کی سوندھی سوندھی خوشبو راہگیروں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی، جماعت علی نے اپنے والد کریم شاہ سے کہا: "بابا! رس پینے کو جی چاہ رہا ہے۔"

کریم شاہ نے خادم کو حکم دیا کہ کسانوں سے چار پیسے کا رس خرید لاؤ۔ خادم نے جا کر کسانوں سے کہا: "شاہ صاحب کے لیے چار پیسے کا رس دے دو۔ یہ پیسے رکھ لو۔" ایک کسان نے منہ بنا کے جواب دیا: "رس پینا ہے تو دکان پر جاؤ۔ ہم راب بناتے ہیں، رس نہیں بیچتے۔" کریم شاہ نے کسان کا یہ جواب سنا، اُن کے سامنے ایک عورت گائے کا دودھ دوہ رہی تھی، انھوں نے گائے کو مخاطب کر کے کہا: "گائے! یہ لوگ ہمیں قیمتاً رس نہیں دیتے تو تُو انھیں دودھ مفت کیوں دیتی ہے؟" یک بارگی گائے نے عورت کے منہ پر زور سے لات ماری۔ عورت چیخ مار کے پیچھے جا گری پھر اٹھی اور بھاگتی ہوئی اپنے آدمیوں کے پاس پہنچی: "ہے ہے غضب ہو گیا، تم لوگوں نے شاہ جی کا کہنا نہیں مانا، اب بستی پر ہمیشہ قحط اور بیماریاں ٹوٹیں گی، جلدی جاؤ، شاہ جی سے معافی مانگو، وہ کہیں آگے نہ نکل جائیں۔" کسان بھاگے ہوئے آئے، انھوں نے معافی مانگی اور کریم شاہ سے اصرار کیا کہ وہ رس پی لیں۔ کریم شاہ نے انھیں معاف کر دیا لیکن کہا کہ "راہگیروں کو تمھاری بستی سے اب کوئی تکلیف ہوئی تو یاد رکھنا، آس پاس کے دیہات کھنڈر میں تبدیل ہو جائیں گے۔"

مغل بادشاہ اکبرِ اعظم نے پیر جماعت علی شاہ کے آبا و اجداد کو بڑے بڑے انعامات سے نوازنا چاہا لیکن انھوں نے زمین کے ایک قطعے کے سوا بادشاہ سے کچھ نہیں لیا۔ وہ قطعہ پسرور ضلع سیالکوٹ سے نو میل دور علی پور سیداں کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں ۱۸۴۰ء میں جماعت علی کی پیدائش ہوئی۔ اُس کی پیدائش سے مہینہ بھر پہلے ایک مجذوب علی پور کی خاک مٹھیاں بھر بھر کر لوگوں میں تقسیم کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا: "اِس صدی کا مسیحائے طریقت آ رہا ہے۔ خوشبو لگاؤ، گلستاں مہکاؤ۔" یہ مٹی مجذوب نے جسے بھی دی اُس کے ہاتھ سے خوشبو کبھی نہ گئی۔ پیر جماعت علی شاہ اپنی محفلوں میں ایسے شخص کی موجودگی محض اس کے ہاتھ کی خوشبو سے محسوس کر لیتے اور بلند آواز سے کہتے: "حضرت! اگلی صف میں تشریف لے آئیے، آپ ہمارے گواہوں میں سے ہیں۔"

سید کریم شاہ سے اپنے نومولود بیٹے کا نام رکھنے کی درخواست کی گئی۔ انھوں نے جواب دیا: "جس نے پیدا کیا ہے، نام بھی وہی دے گا۔" دو دن بعد انھوں نے مسجد میں اعلان کیا کہ ان کے لڑکے کا نام جماعت علی شاہ ہے۔ علاقے میں ایسا نام آج تک نہیں رکھا گیا تھا لیکن اس سے پہلے کسی نے ایک فرد کو ایک جماعت بنتے بھی تو نہیں دیکھا تھا۔ کہا جاتا ہے، بیسویں صدی میں پیر جماعت علی شاہ سے زیادہ مُرید کسی پیر کے نہیں ہوئے۔

امیرِ ملت کو بچپن ہی میں شہبازِ ولایت کہا جانے لگا تھا، چار پانچ سال کی عمر ہو گی۔ ایک بار کوئی سیال کوٹی عالم اپنے گھوڑے پر جماعت علی کے والد سے ملنے آئے۔ وہ جانے لگے تو جماعت علی نے اپنے والد سے کہا: "ابا! مسافر کو ایک گھوڑی دے دیجیے۔" سیال کوٹی عالم بولے: "صاحب زادے! میرے پاس اعلا نسل کا ایک گھوڑا موجود ہے، گھوڑی کی ضرورت نہیں۔" جماعت علی کے والد نے کہا: "حضرت! بچے کی ضد ہے، آپ اصطبل سے ایک گھوڑی لیتے جائیے۔ اچھا ہے، بچے کو مہمان نوازی کے آداب شروع سے معلوم ہو جائیں۔" انھوں نے ایک خادم کو گھوڑی لانے کا حکم دیا۔ گھوڑی آ گئی، سیال کوٹی عالم اپنے گھوڑے پر بیٹھ کے گھوڑی کی رسی تھامے

فیض بخش نور عالم سرِ حق روشن ضمیر
نور عینی شاہ جماعت ہر کساں را دستگیر

علی پور سیداں سے روانہ ہو گئے۔ وہ بستی سے کچھ ہی میل آگے آئے ہوں گے کہ دیکھتے دیکھتے اَبر چھایا اور پانی ٹوٹ کر برسنے لگا۔ عالم کو کئی گھنٹے ایک کھنڈر میں پناہ لینی پڑی، بارش رُکنے پر وہ اپنی پناہ گاہ سے نکلے۔ یکایک چھ سات فٹ لمبا ایک زہریلا سانپ تیزی سے اُن کے گھوڑے کی طرف لپکا، اُس نے پھن اُٹھا کے گھوڑے کی ران ڈس لی۔ گھوڑے کے منہ سے نیلا جھاگ نکلنے لگا، اس نے تڑپ تڑپ کر وہیں دم توڑ دیا۔ گھوڑے کے بعد سانپ عالم کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ انھیں ڈستا، علی پور سیداں کے شہبازِ ولایت کی گھوڑی نے سانپ کے پھن پر پاؤں رکھ دیا۔ سانپ لہرا کے گھوڑی کی ٹانگ سے لپٹ گیا لیکن گھوڑی نے اُس کے پھن سے اُس وقت تک پیر نہیں اُٹھایا جب تک سانپ مردہ ہو کر ٹانگ سے خود نہ گر پڑا۔ عالم پر سکتہ طاری تھا۔ وہ جماعت علی کا شکریہ ادا کرنے واپس علی پور سیداں آئے۔ آبادی کے باہر ہی جماعت علی سے اُن کی ملاقات ہو گئی۔ جماعت علی دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ عالم نے گھوڑی سے اُتر کر انھیں سلام کرنا چاہا لیکن جماعت علی نے کہا: ”آپ آقائے نام دار کی شریعت کے پاسبان ہیں، آپ کو زیب نہیں دیتا کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے سپاہی کو تعظیم دیں۔ براہِ کرم سیال کوٹ واپس جائیے اور علی پور کے سیّدوں کے لیے دعائے خیر فرمائیے۔“

جماعت علی کی عمر چار سال، چار ماہ، چار دن کی ہو گئی۔ اُسے قرآن حفظ کرنے کے لیے مسجد بھیج دیا گیا۔ بچپن سے اُس میں خودداری، بُردباری، تواضع اور مروّت کی خوبیاں موجود تھیں۔ وہ اپنے ننھے دوستوں کو بھی فضول کھیل کود سے منع کرتا۔ اس چھوٹی سی عمر میں بھی اُس کا بیشتر وقت ذکرِ الٰہی میں بسر ہوتا۔ لباس ہمیشہ مکمل اور صاف ستھرا رہتا۔ جماعت علی نے قرآن بہت جلدی حفظ کر لیا۔ اِس خوشی میں پلاؤ زردے سے پوری آبادی کی دعوت کی گئی، جماعت علی علی پور سیداں کا پہلا بچّہ تھا جس نے اتنی کم عمری میں قرآن حفظ کیا۔ صوم و صلوٰۃ کا وہ اُس وقت بھی پابند تھا۔ جب سے اُسے فرائض کا شعور آیا، ایک نماز بھی قضا نہ ہوئی۔

اُنیسویں صدی کے وسط میں سفر بے حد دشوار تھا۔ عام طور پر سڑکیں تھیں نہ ریلیں۔ لوگ گھوڑوں اور بیل گاڑیوں پر یا پیدل سفر کرتے تھے۔ جماعت علی نے حصولِ علم کے لیے دُور دُور تک سفر کیا اور مشکلات کا مسکراتے ہوئے سامنا کرتے رہے۔ سو ڈیڑھ سو سال پہلے علی پور سیداں سے لاہور تک سفر کرنا مشکل ہوتا ہو گا مگر جماعت علی نے سہارن پور، کان پور، لکھنؤ اور گنج مراد آباد جیسے دُور دراز علاقوں میں جا کر علم حاصل کیا۔

تحصیلِ علم کے بعد ایک روز جماعت علی کا پیر امام علی شاہ سے سامنا ہوا۔ پیر امام علی بے قرار ہو کر کھڑے ہو گئے اور بولے: ”می تافت ستارہ بلندی۔“

مُریدوں نے پوچھا: ”حضرت! آپ نے اس نوجوان کو کیسا پایا؟“

”اس نوجوان کی پیشانی پر مَیں جو نور آج دیکھ رہا ہوں، کل اُسے پوری اسلامی دُنیا دیکھے گی۔ یہ نوجوان قطبیت کے عہدے پر فائز ہے، شہبازِ ولایت ہے۔ اس کے مُرید ہمالاسے راس کماری تک پھیلے ہوئے ہوں گے۔“

تعلیم کی تکمیل پر امیرِ ملت پیر جماعت علی کو اورینٹل کالج لاہور میں اُستاد کے عہدے کی پیش کش ہوئی۔ انھوں نے اپنے والد سے اس کا ذکر کیا، والد سخت برافروختہ ہوئے: ”جماعت علی! میں نے تمھیں اس لیے نہیں پڑھایا کہ تم علم فروخت کرو۔ تمھارا کام خدمتِ خلق ہے۔ رمضان میں تم مجھے قرآن سنایا کرو اور باقی سال خلق کی خدمت میں گزارو۔“ امیرِ ملت نے اپنے والد کی نصیحت گرہ میں باندھ لی اور ساری عمر کسی سے کوئی نذرانہ قبول

جھروکے

حضرت عمرؓ نے ۱۶ھ میں بیت المقدس کی فتح کے بعد فوجی افسروں اور عمّال کے ساتھ کئی دن تک وہاں قیام کیا۔ ایک روز حضرت بلالؓ نے دیکھا کہ فوجی افسر پرند کا گوشت اور میدے کی روٹیاں کھاتے ہیں مگر عام سپاہی کو معمولی کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ انھوں نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے افسروں سے اِس سلسلے میں جواب طلب کیا۔ افسروں نے بتایا: ”امیر المومنین! جتنی لاگت پر حجاز میں روٹی اور کھجور ملتی ہے، اتنی ہی لاگت پر یہاں پرند کا گوشت اور میدے کی روٹیاں مل جاتی ہیں۔“ اِس معقول جواب پر حضرت عمرؓ نے زیادہ گفت و شنید مناسب نہیں سمجھی لیکن یہ حکم دے دیا کہ ”ہر سپاہی کو تنخواہ اور مالِ غنیمت کے علاوہ کھانا بھی ملنا چاہیے۔“

✿

خلیفہ متوکل کے زمانے کا ذکر ہے۔ مصر کے قاضی القضاۃ ابوبکر بن محمد کے متعلق عام شکایت تھی کہ وہ انصاف و عدل نہیں کرتا۔ رشوت کھاتا ہے۔ لوگ اُس سے انتہائی نالاں تھے۔ متوکل کو یہ بات معلوم ہوئی تو اُس نے تحقیقات کا حکم دیا۔ تحقیقات کے نتیجے میں لوگوں کی شکایات صحیح ثابت ہوئیں۔ متوکل نے قاضی کی داڑھی مُنڈوا کے اُسے گدھے پر بٹھایا اور سارے شہر میں گشت کروایا۔ اس کے علاوہ کئی روز تک اُسے بیس بیس کوڑے لگائے جاتے رہے۔

راجد علی انصاری کی ورق گردانی

نہیں کیا۔

اُن کی شادی ماموں زاد بہن سے ہوئی، وہ انتہائی پارسا اور تہجد گزار بی بی تھیں۔ کام کاج کے دوران بھی ذکر و وظائف میں مشغول رہتیں۔ امیرِ ملت کسی رہبرِ کامل کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے کئی کواڑ کھٹکھٹائے لیکن ہر جگہ آگے بڑھنے کو کہہ دیا گیا۔ امیرِ ملت پر عشقِ الٰہی کا غلبہ تھا۔ مہینوں آنکھوں سے آنسو جاری رہتے۔ انھی دنوں قطبِ زماں بابا فقیر محمد چوراہی نقش بندی کا علی پور سیداں کے قریب موضع چک قرشیاں میں آنا ہوا۔ امیرِ ملت اُن سے ملنے گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک نے سمجھا "آنے والا آ گیا"، دوسرے کا دل پکار اُٹھا "مسافر آخر منزل پر پہنچ گیا"۔ بابا نے امیرِ ملت کو چورہ آنے کی دعوت دی اور دعائیں دے کر رخصت کر دیا۔

امیرِ ملت کا سکون جاتا رہا۔ انھیں شب و روز، صبح و شام بابا کا تصور رہتا۔ کوئی چپکے چپکے کہتا، "اب منزل مل گئی ہے تو یہ دوری کیسی؟" ایک دن امیرِ ملت کسی کو بتائے بغیر چورہ کے لیے پیدل روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے بابا سے ملاقات کی۔ بابا بولے: "ایسی بھی کیا جلدی تھی، خیر آ ہی گئے ہو تو بیٹھو۔" انھوں نے امیرِ ملت سے بیعت لی اور اپنی دستار اُتار کر اُن کے سر پر رکھ دی اور انھیں اپنا خلیفہ مقرر کیا: "جاؤ، اللہ کو یاد کرو اور لوگوں کو اُس کا نام بتاؤ۔"

بابا سے دیرینہ مریدوں نے شکایت کی کہ ہم عرصہ دراز سے جناب کی خدمت میں حاضر ہیں، ہمیں کچھ عطا نہ ہوا۔ یہ علی پور سیداں والا آج ہی آیا اور آج ہی سب کچھ لے گیا۔ بابا نے جواب دیا: "جو کچھ میں جانتا ہوں، تم نہیں جانتے۔ علی پور سیداں والا اپنے ساتھ چراغ، بتی، تیل سب کچھ لایا تھا۔ میں نے تو چراغ صرف روشن کیا ہے۔"

امیرِ ملت اپنے مرشد کا بے حد احترام کرتے تھے۔ چورہ پہنچتے تو اسٹیشن سے خانقاہ تک ننگے پیر جاتے اور ننگے پیر خانقاہ سے اسٹیشن لوٹتے۔ چورہ میں قیام کے دوران جوتے نہ پہنتے۔ جب اُن کے مرشد علی پور سیداں آتے تو امیرِ ملت بہتر سے بہتر کھانے پکواتے۔ بابا کھانا تناول کرتے تو امیرِ ملت غلام کی طرح ہاتھ باندھے پیچھے کھڑے رہتے۔ بابا کے ہمراہ آئے ہوئے درویشوں کے ہاتھ بھی وہ خود دھلاتے اور اُن کے سامنے بیٹھنا بے ادبی سمجھتے۔ بابا کی وفات کے بعد اُن کے بیٹوں میں سے کوئی علی پور سیداں آتا تو امیرِ ملت ننگے پیر آبادی سے نکل کے اُن کا استقبال کرتے اور انھیں سواری پر بٹھا کر خود پیدل خانقاہ تک آتے۔ پھر انھیں اپنی مسند پر بٹھا کے اُن کے قدموں میں بیٹھنا سعادت سمجھتے۔ چورہ کا کوئی عام آدمی بھی آ جاتا تو امیرِ ملت ایسی خدمت کرتے جیسے اپنے مرشد کی خدمت کرتے تھے اور واپسی میں مہمان کو مالا مال کر دیتے۔ مال و اسباب لے جانے کے لیے اُسے علی پور سیداں کے کئی پھیرے کرنے پڑتے۔

امیرِ ملت تعظیمی سجدہ حرام سمجھتے تھے، کسی کو قدم بوسی کی اجازت نہ دیتے۔ کوئی عقیدت مند پاؤں کی طرف جھکتا تو سخت لہجے میں تنبیہ کرتے: "بدبخت! سنت ترک کر کے حرام فعل کا مرتکب ہوتا ہے، مجھے بھی گناہ گار کرتا ہے۔" غیر مسلم عقیدت مند اپنے رواج کے مطابق زمین پر ماتھا ٹیکتے تو امیرِ ملت غصے میں مسند سے کھڑے ہو جاتے: "ہمارے مذہب میں یہ منع ہے۔"

امیرِ ملت نے حج بے شمار کیے۔ اُن کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔ انھوں نے پہلا حج ۱۳۱۰ھ میں کیا تھا۔ حج کے لیے ہمیشہ خود کو تیار رکھتے۔ ایامِ حج سے پہلے ہی انھیں بلاوے کا بے چینی سے انتظار رہتا۔ عشقِ رسولؐ میں روتے رہتے۔ جب تک خود رسول اللہؐ کا ارشاد نہ ہو جاتا، روانگی کا ارادہ نہ کرتے۔ کبھی روضۂ رسولؐ کے کنجی بردار لکھتے کہ "مجھے حضورؐ کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ آپ اس سال پھر حاضر ہوں گے۔" کبھی حضورؐ خود یہ اعزاز بخشتے اور مدینے آنے کی بشارت دیتے۔ اجازت ملنے پر امیرِ ملت کی حالت قابلِ دید ہوتی۔ روتے جاتے، شعر پڑھتے جاتے۔ دنیا اُن کے ذہن سے نکل جاتی، وہ خدام اور گھر والوں تک کو پہچاننے سے انکار کر دیتے۔ کبھی مدینے پہنچنے کی خواہش اچانک شدت اختیار کر جاتی۔ امیرِ ملت سفر میں جہاں بھی ہوتے، وہیں سے حکم دیتے: "چلو سرکار بلاتے ہیں۔" خادم بتاتے: "حضرت! سفر خرچ نہیں ہے۔ کچھ توقف فرمائیے۔ علی پور سیداں سے انتظام ہو جائے گا۔" امیرِ ملت ناراض ہو جاتے۔ "بدبختو! علی پور سیداں پر اعتبار کرتے ہو اور دو جہاں کے والی پر بھروسا نہیں کرتے۔ جسے میرے ساتھ چلنا ہے وہ چلے، میں تو چلا۔" وہ اسی طرح خالی ہاتھ اسٹیشن روانہ ہو جاتے۔ وہ جب بھی اس ادا سے سفر کرتے، راستے میں قدم قدم پر تمام اسباب مہیا ہو جاتے۔ بادشاہ بھی اس کروفر سے سفر نہ کرتے ہوں گے۔ امیرِ ملت مسکرا کے ساتھیوں سے کہتے: "ساتھیو! میرا اللہ کتنا بڑا ہے۔ میرے رسولؐ کی کیا شان ہے۔"

۱۹۱۷ء میں امیرِ ملت ایک طویل دورے کے بعد لاہور میں مقیم تھے۔ سردی پڑ رہی تھی۔ امیرِ ملت کو ایک سو چار ڈگری بخار تھا۔ لوگ کبھی نبض دیکھتے، کبھی دوا دیتے لیکن بخار کم نہ ہوا۔ اتنے میں خادم نے اطلاع دی کہ نعت گو شاعر حافظ پیلی بھیتی آئے

سب تک

ہیں۔ امیرِ ملت کے چہرے پر بشاشت آ گئی۔ "حافظ صاحب کو فوراً بلاؤ۔" حافظ صاحب اندر آئے۔ امیرِ ملت کمزوری کے باوجود اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ "حافظ صاحب! آپ میرے آقا کے درباری شاعر ہیں۔ افسوس اِس بیماری پر، اِس نے مجھے کسی قابل نہ رکھا، کم سے کم دروازے پر آ کے آپ کا استقبال کر سکتا۔" چند منٹ بعد انھوں نے حافظ پیلی بھیتی سے فرمائش کی: "کوئی تازہ نعت عطا ہو۔"

حافظ پیلی بھیتی دوزانو بیٹھ کے پُر درد لہجے میں اشعار سنانے لگے۔

زائروں کی بھیڑ ہو، روضہ ترا ہو، میں نہ ہوں
وائے ناکامی کہ اک خلقِ خدا ہو، میں نہ ہوں
صدقے اُس روضے کے جس پر سر سے دل سے جان سے
اک جہاں اک خلق، اک عالم فدا ہو، میں نہ ہوں

امیرِ ملت نے بخار کے باوجود جوش میں آ کر لحاف اتار پھینکا۔ کسی نے دبی زبان سے کہا: "حضرت! لحاف اوڑھے رہیے، کہیں نمونیا نہ ہو جائے۔"

حافظ صاحب نے یہ شعر پڑھا۔

میں وہاں ہوں، وہ وہاں ہوں یا نہ ہوں، پر یہ نہ ہو
شاہ کے دربار میں چرچا مرا ہو، میں نہ ہوں

امیرِ ملت نے اُسی وقت کھڑے ہو کر جوتے پہنے اور خادم کو حکم دیا: "ابھی اسٹیشن چلو۔ بھلا شاہ کے دربار میں چرچا مرا ہو، میں نہ ہوں۔" حاضرین نے بہت روکنا چاہا۔ بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید سرسامی کیفیت ہے۔ امیرِ ملت نے ایک شخص کو نبض دکھائی: "دیکھو، مجھے نہ بخار ہے، نہ کوئی اور مرض۔ یہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ میں سرسامی کیفیت میں دماغی توازن کھو بیٹھا ہوں۔" لوگ حیران رہ گئے۔ جس شخص کو چار دن سے ایک سو تین اور ایک سو چار بخار تھا، اِس وقت اُس کی حالت بہت اچھی تھی، گویا بخار ہوا ہی نہ تھا۔

مدینہ قریب آتا تو امیرِ ملت کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اُٹھتا۔ ساتھیوں سے کہتے: "جو کچھ ہے، لٹا دو۔ خوب تقسیم کرو، جتنا دو گے اُس کا ہزار گنا ملے گا۔ یہ لوگ حضور کے ہمسائے ہیں۔ ان کا سب سے زیادہ حق ہے، انھی کی خدمت کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ ہر آدمی کے یہ نصیب کہاں کہ وہ آقا کے ہمسایوں کی دعا کا مستحق بنے۔" مدینے میں قیام کے دوران وہ خدام سے کہتے: "دیکھو، کوئی سائل خالی ہاتھ نہ جانے پائے۔ یہ انھی کا حوصلہ تھا ورنہ کوئی بادشاہ بھی اپنا دروازہ ہر وقت کھلا نہیں رکھ سکتا۔" امیرِ ملت مدینے میں کئی کئی مہینے قیام کرتے مگر نہ سائل مانگنے سے رُکتے، نہ امیرِ ملت دینے سے۔ اگر کوئی کہتا: "حضرت! یہ سائل تو ابھی لے کر گیا تھا، دوبارہ آ گیا ہے۔" امیرِ ملت جواب دیتے: "ہمارے پاس کون سی کمی آ گئی ہے۔ اسے اور زیادہ دو، اسے زیادہ کی ضرورت تھی ... دوبارہ کیوں آتا۔" بے تکلف لوگ اکثر سمجھاتے: "ذرا ہاتھ روک کر خرچ کیا کرو۔ سائلوں کا کیا ہے، یہ تو اسی طرح پیچھے پڑے رہیں گے۔" امیرِ ملت کہتے: "میں اِن لوگوں کو بلانے نہیں جاتا۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ اُس نے انھیں میرے پاس بھیجا ورنہ وہ مجھے اِن لوگوں کے دروازے پر بھی بھیج سکتا تھا۔"

ترکوں کے زمانے میں امیرِ ملت کو مدینے میں بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ وہ روضے کی جالی کے اندر رات گزارتے۔ صبح باہر آتے تو چہرے پر عجیب روشنی ہوتی۔ نگاہ جما کر دیکھنا دشوار ہو جاتا۔ انھیں مدینے کی ہر شے سے محبت تھی۔ کھجور، خاکِ شفا، رومال، ٹوپیاں، تسبیح اور جانماز۔ اِن چیزوں کے علاوہ وہ مدینے سے بہت سے بیج بھی ساتھ لاتے اور انھیں خانقاہ میں بوتے۔ اُگنے کے بعد اُس میں سے کوئی چیز دسترخوان پر آتی تو امیرِ ملت بول اُٹھتے: "آ... کے شہر کی خوشبو آ رہی ہے۔" پھر وہ نہایت شوق سے اُسے کھاتے، دوسروں کو بھی خوش ہو کر کھلاتے۔ مدینے سے و... صراحیاں بھی لاتے تھے، سفر میں وہیں کی ایک صراحی ساتھ رکھتے اور ہمیشہ اُسی میں سے پانی پیتے، وہاں سے وہ کپڑا بھی لاتے او... دوستوں، عزیزوں، عقیدت مندوں میں تقسیم کر کے خوش ہوتے۔ ... عموماً مدینے ہی کا کپڑا استعمال کرتے اور فخر سے کہتے: "یہ آقا کے شہر کا ہے۔"

ایک بار سردی میں نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ امیرِ ملت سے ملنے پہنچے۔ امیرِ ملت نے خادم کو حکم دیا: "میرے لیے کھدر کے کپڑے لاؤ۔" خادم نے کہا: "سرکار! نواب صاحب کیا سوچیں گے کہ آپ کھدر پہنے بیٹھے ہیں۔" امیرِ ملت نے جواب دیا: "یہ کھدر مدینے کا ہے۔ نوابی اور ممدوٹی سب دھری رہ جاتی ہے۔ یہ کھدر نصیب والوں کو ملتا ہے۔"

ایک دن وہ مکے کے کسی بازار سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے سبزی فروش کی صدا سنی: "پودینہ خریدو اور مدینے کی زیارت کرو۔" امیرِ ملت نے خادم کو حکم دیا: "جلدی سے سارا پودینہ ... خدا اِسے سچا کرے۔"

امیرِ ملت رسولِ اکرمؐ کے عاشقِ صادق تھے۔ ایک دن لاہور میں مسلم لیگ کا اجتماع تھا، علامہ شبیر احمد عثمانی بھی آئے ...

تھے۔ انھوں نے امیرِ ملت سے پوچھا: "حضرت! سنا ہے اہلِ لاہور میرے دو بڑے آزار ہیں، ایسا کیوں ہے؟" امیرِ ملت نے جواب دیا: "مولوی صاحب الگ سمجھتے ہیں، آپ نبیِ اکرمؐ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کرتے ہیں۔"

"میں قرآن کی شان میں بے ادبی کرنے والے کو کافر اور مرتد سمجھتا ہوں۔" امیرِ ملت نے جوش میں علامہ عثمانی کو سینے سے لپٹا لیا: "آپ میرے بھائی ہیں، آپ میرے بھائی ہیں۔" وہ انھیں اپنے ساتھ اسٹیج پر لے گئے اور سامعین سے مخاطب ہو کے کہا: "خبردار! علامہ کے ساتھ کوئی گستاخی نہ کی جائے۔ انھوں نے میرے سامنے اپنے عقیدے کی وضاحت کر دی ہے۔"

امیرِ ملت نے رشد و ہدایت کی ابتدا علی پور سیداں سے کی۔ اس کے بعد انھوں نے آس پاس کے دیہات و قصبات تک دائرۂ عمل بڑھایا، پھر پنجاب بھر کے دورے شروع کر دیے۔ راستے میں گاؤں پڑتے تو پانی مل جاتا ورنہ دُور دُور تک پانی میسر نہ آتا۔ امیرِ ملت نے اِن مشکلات کی پروا نہ کی۔ سفر جاری رکھا۔ پنجاب کے بعد دہلی اور یو پی اور سی پی اور دکن اور برِصغیر کے دُور دراز حصے۔ امیرِ ملت راہ کی غیر آباد مسجدوں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ٹھیرتے۔ اذان دی جاتی، کبھی کوئی آ جاتا، کبھی کوئی نہ آتا۔ امیرِ ملت گھر گھر جا کر لوگوں کو نماز کے لیے بلاتے۔ ایک مرتبہ وہ کسی غیر آباد مسجد میں مقیم تھے۔ نماز کے وقت ایک شخص آیا، اُس نے اذان دی اور جلدی سے چلا گیا۔ امیرِ ملت متعجب رہ گئے۔ دوسری اذان کے وقت وہ شخص پھر آیا۔ اس بار بھی وہ اذان دے کر واپس جانے لگا۔ امیرِ ملت نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا: "میاں! تم اذان دیتے ہو، نماز کیوں نہیں پڑھتے؟" اُس نے جواب دیا: "نماز گاؤں میں کوئی نہیں پڑھتا، میں اذان صرف اس لیے دیتا ہوں کہ مجھے اس کا معاوضہ ملتا ہے۔ اگر گاؤں کے لوگ اذان نہیں سنیں گے تو مجھے فصل پر گندم نہیں دیں گے۔" امیرِ ملت نے اُسے اپنے ساتھ نماز پڑھوائی۔ پھر گاؤں جا کر لوگوں کو نماز کی اہمیت سے آگاہ کیا اور سب کو اپنے ساتھ لے کر مسجد آئے۔ باجماعت نماز ادا کی گئی۔ کبھی کبھی اِن دوروں کی مدت طویل ہو جاتی مگر امیرِ ملت اپنا اور اپنے ہم سفروں کا بار کسی دوسرے پر نہ ڈالتے۔ کھانا پکانے کا سامان عموماً ساتھ ہوتا۔ جہاں ٹھیرتے، اپنا کھانا خود پکاتے۔ اپنی وجہ سے دوسروں کو تکلیف نہ ہونے دیتے۔ کھانے پینے کا سامان ختم ہو جاتا تو چنے یا مکئی بھنوا کر کھا لیتے۔

تھے۔

امیرِ ملت سب سے زیادہ تاکید نماز روزے کی کرتے تھے۔ اگر کوئی نہ مانتا تو اس کے ساتھ سختی برتتے۔ دوسروں کو حکم دیتے کہ اس کے ساتھ علیک سلیک، بول چال، کھانا پینا سب بند کر دو۔ جو لوگ زیادہ سرکشی کرتے، اُن کے متعلق حکم دیتے، اِن کا جنازہ نہ پڑھا جائے، یہ مر جائیں تو انھیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے۔

رہتک اور حصار کے نومسلموں میں دوسرا نکاح حرام سمجھا جاتا تھا۔ امیرِ ملت نے انھیں بیواؤں کا نکاح نہ کرنے کی خرابیاں بتائیں اور سمجھایا کہ اِس طرح بدکاری ترویج پاتی ہے۔ وہ لوگ نہ مانے، مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ جاگیردار اُن کی پُشت پناہی کر رہے تھے۔ امیرِ ملت لوگوں کو جاگیرداروں کی ڈیوڑھیوں میں لے گئے۔ وہاں اُن کے اشارے پر زمین کھودی گئی، بعض جگہوں سے نوزائدہ بچوں کے ڈھانچے برآمد ہوئے۔ اب امیرِ ملت لوگوں کو جنگل لے گئے، اُن کی انگلی جدھر اُٹھتی، کھدائی ہونے لگتی، لوگوں کی آنکھیں کُھلنے لگیں۔ وہ اپنی مخالفت پر سخت شرمندہ ہوئے۔

ایک بار امیرِ ملت نے سکھوں کے علاقے ترن تارہ جا کر تبلیغ کا ارادہ کیا۔ وہ اپنے ساتھ زیادہ نفری لے جانا نہیں چاہتے تھے۔ ارادت مندوں نے سمجھایا: "حضرت! ترن تارہ خطرناک علاقہ ہے، وہاں کے لوگ بڑے جنگ جُو ہیں۔ آپ جانا ہی چاہتے ہیں تو جاں نثاروں کو ساتھ لے کر جائیے۔" امیرِ ملت نے صرف ایک خادم کو ساتھ لیا۔ چند مریدوں نے ضد کی: "سرکار! ہم آپ کو تنہا نہیں جانے دیں گے۔" امیرِ ملت کا چہرہ سُرخ ہو گیا: "کیا تم لوگ میرے محافظ ہو؟ میرا محافظ میرے ساتھ ہے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔"

توقع کے خلاف ترن تارہ میں امیرِ ملت کا پُرتپاک استقبال کیا گیا، ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ امیرِ ملت نے تقریر شروع کی۔ "حضرات! میں آپ کا متشکر ہوں، آپ نے اسٹیشن پر جمع ہو کر مجھے خوش آمدید کہا اور اب میری تقریر سُننے آئے ہیں، آپ نے میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ میں آپ کے سامنے بلند آواز سے اپنے خدا کی کتاب کی ایک آیت پڑھ کر تلوار پر دم کرتا ہوں، وہ تلوار کسی کو بھی ماری جائے، ہرگز اثر نہیں کرے گی۔ اسی طرح آپ میرے پاس کیسا ہی قریب المرگ مریض لے آئیے، میں اسی جلسے میں اس پر آیت پڑھ کر دم کرتا ہوں۔ یقین کیجیے، وہ تندرست ہو کر اپنے پیروں سے گھر جائے گا۔" کسی نے امیرِ ملت کی طرف ایک تیز دھار تلوار بڑھا دی: "مولوی جی! آپ کو جو کچھ پڑھنا ہے، پڑھ کر پھونک دیجیے۔ میں اسی تلوار سے ایک وار میں اگر بیل کی گردن نہ اُڑا دوں تو میرا نام نہیں۔" امیرِ ملت نے مسکرا کے تلوار پر دم کیا: "لو میرے بھائی! مگر تم اِس سے بیل کی گردن تو کیا اپنی تمام طاقت کے باوجود سنگترا تک نہیں کاٹ سکتے۔" انھوں نے میز پر ایک سنگترا رکھ دیا۔ اُس شخص نے پوری قوت سے تلوار سنگترے پر ماری، سنگترا ویسے کا ویسا رکھا رہا۔ امیرِ ملت نے اُس شخص کو ایک چھوٹا سا چاقو دیا: "لو، سنگترا اِس سے کاٹ لو۔"

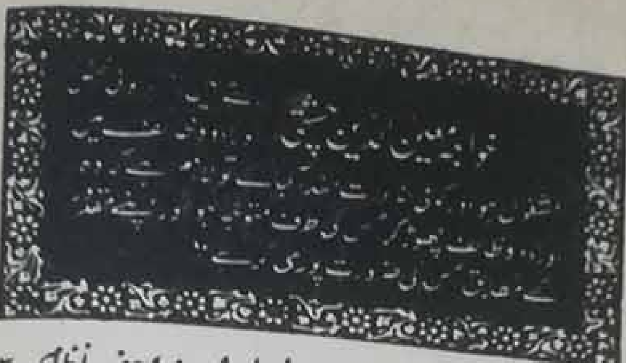
بعض مخالف امیرِ ملت پر طنز کرتے کہ یہ پیری فقیری نہیں کرتے، دُکانداری کرتے ہیں۔ امیرِ ملت جواب دیتے: "مانا کہ یہ دُکانداری ہے مگر ذرا سوچو، گاہک کو اگر مرضی کا مال نہ ملے تو وہ دوبارہ کب دُکان پر پھٹکتا ہے۔ مال ہو تبھی دُکان چلتی ہے، بے مال دُکانوں پر تالے پڑے رہتے ہیں اور تختوں کے نیچے کُتّے لوٹتے ہیں۔"

ایک مرتبہ امیرِ ملت رسولِ اکرمؐ کے روضے پر تھے۔ یکایک انھوں نے ندا سُنی: "جماعت علی! ہندوستان جا کر سیدھے حیدرآباد پہنچو، وہاں مولوی خیرالمبین ملیں گے۔ انھیں ہمارا سلام پہنچانا۔"

امیرِ ملت تیز گامی سے بہ عجلت حیدرآباد دکن پہنچے۔ اسٹیشن پر انھوں نے تانگے والے سے پوچھا: "میاں! یہاں کوئی مولوی خیرالمبین رہتے ہیں؟" تانگے والے نے کہا: "بیٹھیے۔ پہنچائے دیتا ہوں۔" امیرِ ملت بیٹھ گئے۔ تانگے والے نے انھیں نبی خانے پر اُتار دیا۔ امیرِ ملت عمارت کے اندر گئے۔ محفل جمی ہوئی تھی۔ امیرِ ملت کی وضع قطع حیدرآبادی تہذیب سے یکسر مختلف تھی۔ لوگ حیران ہوئے کہ یہ اجنبی کون ہے۔ مسند پر خیرالمبین بیٹھے تھے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر کہا: "معزز مہمان! خوش آمدید۔ فقیر کو خیرالمبین کہتے ہیں۔ یہاں میرے پاس تشریف لے آئیے۔ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آ رہے ہیں؟" امیرِ ملت نے بتایا: "میں نبیِ اکرمؐ کا فرستادہ ہوں۔ حضورؐ نے آپ کو سلام بھیجا ہے۔" مولوی خیرالمبین کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ بار بار امیرِ ملت کے قدموں کی خاک اپنی آنکھوں سے مَلتے اور روتے ہوئے کہتے: "ایسے آقا پہ سلام، ایسے پیامبر پہ سلام۔" انھوں نے امیرِ ملت کو کئی دن مہمان رکھا۔

بعد میں امیرِ ملت کئی بار حیدرآباد گئے۔ وہاں انھوں نے ہمیشہ نبی خانے میں قیام کیا۔ ایسا بھی ہوا کہ گئے تو نظام کی دعوت پر۔ اسٹیشن پر شاہی سواریاں استقبال کے لیے پہنچیں مگر امیرِ ملت پہلے سیدھے نبی خانے گئے اور مولوی خیرالمبین کے قدموں میں بیٹھے رہے۔ شاہی ملازم بار بار خوشامد کرتے کہ "حضرت! جلد چلیے، ہمیں حضور نظام کے عتاب سے دوچار نہ ہونا پڑے۔"

سب رنگ



امیرِ ملت بادلِ ناخواستہ مولوی عبدالمبین سے اجازت لے کر شاہی مہمان خانے آ گئے۔

ایک مرتبہ حیدرآباد دکن میں امیرِ ملت کا وعظ تھا۔ نظام بھی موجود تھے۔ امیرِ ملت نے پردے کی حرمت پر بولتے ہوئے بے پردہ خواتین کو سخت سرزنش کی اور کہا: "ڈرو اس وقت سے جب تمہارے جسم کے وہ حصے دوزخ میں ڈالے جائیں گے جن پر نامحرم کی نظر پڑی ہوگی، شرع کی رو سے بے پردگی کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔" پھر انھوں نے نظام کی طرف رخ کر کے جلال سے کہا: "اب تو مسلمانوں کے بادشاہوں کا عجب عالم ہو گیا، وہ اپنی لڑکیوں کو بے پردہ باہر پھراتے ہیں۔ ایسے بادشاہوں کا بھی اللہ حافظ، ایسی رعایا کا بھی۔"

نظام کی دو جوان لڑکیاں اُن کے ساتھ باہر گھوما کرتی تھیں۔ بعض لوگوں نے انھیں ایک درخواست پیش کی: "پیر جماعت علی شاہ کے وعظ سے سرکار کی توہین ہوئی ہے۔ یہ امر ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔" نظام نے درخواست پر لکھا: "پیر جماعت علی شاہ وہ واحد شخص ہیں جن کی زبان سے میں نے برملا حق بات سنی۔ عالم کی تعریف یہی ہے۔"

ایک دفعہ وعظ کے دوران نظام کی طرف سے بلاوا آیا۔ امیرِ ملت نے کہا: "اُس سے جا کر کہہ دو میں اِس وقت اُس سے بڑی سرکار میں حاضر ہوں۔" نظام کو یہ جواب پہنچا دیا گیا۔ اِس کے بعد نظام نے انھیں رسمی بلاوا کبھی نہیں بھیجا۔ خادم اگر صرف اتنا کہتے: "نظام دعا کا طالب ہے۔"

ایک بار ہندوستان کا برطانوی وائسرائے نظام سے ناخوش تھا کیونکہ اُس کے پاس نظام کی کچھ شکایتیں بھیجی گئی تھیں۔ نظام کو سخت پریشانی تھی۔ انھوں نے ایک قاصد علی پور سیداں روانہ کیا اور اُس سے کہلوایا: "حضرت! دعا کا وقت ہے۔ ممکن ہو تو خاصی کو دیدار کرا دیجیے۔" امیرِ ملت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ قاصد بہت دنوں تک ٹھہرا رہا۔ اُس نے منت و سماجت برابر جاری رکھی۔ آخر ایک دن وہ امیرِ ملت کو راضی کر کے حیدرآباد لے ہی گیا۔ امیرِ ملت نے نظام کے سامنے پہنچتے ہی کہا: "نظام! کیسے حاکم ہو، وقت کا قانون بھی نہیں سمجھتے۔ وائسرائے کو لکھو: تصفیے کے لیے فریقین کی موجودگی ضروری ہے۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں سامنے ہوں تب فیصلہ ہو سکتا ہے، یک طرفہ فیصلہ کسی قانون میں جائز نہیں۔" نظام نے یہی الفاظ وائسرائے کو لکھوا دیے۔ چند دن بعد وائسرائے کا خط آ گیا۔ لکھا تھا: "تحقیق کر لی گئی ہے، وہ شکایت سب غلط

آپ کے مخالفین نے دی تھی۔ وائسرائے ہند حضور نظام سے معذرت خواہ ہیں۔" یہ خط امیرِ ملت کو سنایا گیا۔ امیرِ ملت نے کہا: "وہ لکھتا کیسے نہیں؟ اگر نہ لکھتا تو ہم وائسرائے کسی اور کو مقرر کر دیتے۔"

ایک مرتبہ امیرِ ملت قصور کے قریب واڑہ جا رہے تھے۔ راستے میں بدنام ڈاکو بابا محمد دامل گرفتار کر کے لے جایا جا رہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی تھیں۔ امیرِ ملت کے ساتھ واڑہ کا رہنے والا ایک عقیدت مند بھی تھا۔ اُس نے اُن سے کہا: "حضور! یہ ڈاکو ہمارے گاؤں کا چودھری ہے۔ اِسے اِس حالت میں دیکھ کر مجھے دکھ ہوا۔" امیرِ ملت فوراً بولے: "ہم تجھے دکھی دیکھنا نہیں چاہتے۔" انھوں نے سپاہیوں کو اپنے قریب بلایا اور کہا: "بابا محمد دامل کو ہماری ضمانت پر رہا کر دو۔" سپاہی امیرِ ملت کو جانتے تھے۔ انھوں نے ہتھکڑیاں کھول دیں۔ مگر ڈاکو نے کہا: "میں ڈاکے ڈالنے سے ہرگز باز نہیں آؤں گا۔ آپ میری ضمانت نہ لیجیے۔" امیرِ ملت نے کہا: "ہمیں اپنے ساتھی کی دل جوئی منظور ہے، تمہاری گرفتاری اور رہائی سے ہمیں کیا غرض۔ چپ چاپ ہمارے ساتھ چلے آؤ۔" ڈاکو ساتھ تو ہو لیا لیکن راستے بھر کہتا رہا کہ "آپ نے ناحق میری ضمانت لی۔ میں ڈاکے ڈالنے سے باز رہ ہی نہیں سکتا، خواہ مخواہ آپ کی بدنامی ہوگی۔" امیرِ ملت نے کہا: "تیری وجہ سے ہماری کیا بدنامی ہو سکتی ہے۔ تو ہماری فکر نہ کر۔" چلتے چلتے واڑہ آ گیا۔ ڈاکو نے کہا: "میں واڑے کا چودھری ہوں۔ آپ میرے ضامن ہیں، اگر آپ میرے گھر نہ ٹھہرے تو برادری میں میری ناک کٹ جائے گی۔" امیرِ ملت نے اُس کی درخواست قبول نہیں کی، اپنے ساتھی کے گھر جا کر قیام کیا، وہ ایک غریب جلاہا تھا۔ ڈاکو رات بھر امیرِ ملت کی جوتیوں کے پاس بیٹھا رہا۔ صبح امیرِ ملت نے دریافت کیا: "چودھری! تو اب تک گھر نہیں گیا؟" اُس نے کہا: "جب تک حضور نہیں چلیں گے، میں نہیں جاؤں گا۔" امیرِ ملت نے کہا: "میں چوروں ڈاکوؤں کے گھر نہیں جاتا۔" ڈاکو بولا: "اچھا، میں قسم کھاتا ہوں، اب نہ کبھی ڈاکا ڈالوں گا، نہ کوئی اور برا کام کروں گا۔" امیرِ ملت اُس کے

گھر چلے گئے۔ لوگ کہتے ہیں: اُس کے گھر میں جس درخت کے نیچے امیرِ ملت بیٹھے تھے، بعد میں ڈاکو اُس کی تین پتیاں توڑ کر جسے دے دیتا، اُس کے سب کام پورے ہو جاتے۔

ضلع جھنگ کے موضع بلوانہ میں رجب علی نامی ایک ڈاکو اور قاتل نے لوگوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ حکومت کو گاؤں میں پولیس چوکی قائم کرنی پڑی تھی۔ رجب علی کو رات بھر حوالات میں رکھا جاتا۔ ایک بار امیرِ ملت بلوانہ پہنچے۔ تھانے دار نے آ کر اُن سے کہا: "حضور! دعا فرمائیے، یا تو رجب علی مر جائے یا میں مر جاؤں۔" امیرِ ملت نے کہا: "میں نے ساری عمر کسی کے لیے بددعا نہیں کی۔ تم رجب علی کو یہاں لے آؤ۔" رجب علی کو اُن کے سامنے لایا گیا۔ کچھ عقیدت مند امیرِ ملت کے پیر دبا رہے تھے، تھانے دار نے رجب علی سے کہا: "اوئے! تو بھی چپ کر کے پیر جی کے پیر دبا۔" رجب علی بادلِ ناخواستہ پیر دبانے لگا۔ امیرِ ملت لیٹے ہوئے تھے۔ رجب علی نے جھلاہٹ میں اُن کا پیر زور سے دبا دیا۔ امیرِ ملت نے پوچھا: "یہ کون ہے؟" انھیں بتایا گیا: "رجب علی ہے۔" امیرِ ملت بولے: "سب لوگ ہٹ جاؤ۔ آج صرف رجب علی ہمارے پیر دبائے گا۔" سب لوگ ہٹ گئے۔ رجب علی پیر دباتا رہا، امیرِ ملت بار بار کہتے: "اور زور سے اور زور سے۔" رجب علی اچانک پیر چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "حضور! میں مان گیا آپ کو۔ اگر میں بھینس کی ٹانگ بھی اتنے زور سے دباتا تو ٹانگ سُرمہ ہو جاتی۔ میں بھینس کو دونوں جبڑوں سے پکڑ کر دو کر دیتا ہوں مگر آپ کے ساتھ عجیب بات ہے۔ میں جتنا زور لگاتا ہوں، آپ اور زیادہ کا حکم دیتے ہیں۔" امیرِ ملت نے کہا: "جا رے، پتہ تو کیسا تیرا زور ہے۔ ایک بوڑھے فقیر کے پیر بھی نہیں دبا سکتا۔ آ، ہم لوگوں میں شامل ہو جا۔"

امیرِ ملت کی عمر اسی سال سے تجاوز کر چکی تھی لیکن وہ بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب کرتے۔ مالابار، حیدر آباد، میسور، مدراس، لائل پور اور لاہور کے جلسوں میں آدمی ہی آدمی ہوتے۔ اُن کی آواز دھیمی تھی، لاؤڈ اسپیکر رائج نہیں ہوا تھا مگر آخری صف بھی اُن کا ایک ایک جملہ آسانی سے سُن لیتی تھی۔

امیرِ ملت ایک مرتبہ کشمیر گئے۔ وہاں بعض لوگوں نے یہ بحث چھیڑ دی کہ آیا نبیِ اکرم نور ہیں یا نہیں؟ امیرِ ملت نے کہا: "انسانی عقل ہر شے کے ادراک کا یارا نہیں رکھتی، تم ہر شے کو اپنی ناقص عقل کی کسوٹی پر کیوں پرکھتے ہو۔ میری یہ پگڑی لو، دو آدمی اس کے دونوں سرے پکڑیں پھر اسے میری کمر کے درمیان

سے گزار دیں۔" دو آدمیوں نے اُن کی پگڑی پکڑ کے کمر پر رکھ کے کھینچی، پگڑی کمر کے آر پار ہو گئی۔

جالندھر کے رہنے والے ایک ہم نام شخص سید جماعت علی کو پیروں فقیروں پر مطلق اعتماد نہ تھا۔ ایک دفعہ اُس نے امرتسر کے اسٹیشن پر ایک صوفی کو عقیدت مندوں میں گھرے ہوئے دیکھا۔ جماعت علی نے مسکرا کے سوچا، اچھی دُکان لگائی ہے۔ کچھ دیر میں گاڑی چلنے لگی۔ جماعت علی لپک کر ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اتفاق سے وہ صوفی بھی اُسی ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ جماعت علی کو بتایا گیا، یہ امیرِ ملت پیر جماعت علی شاہ ہیں۔ اتنے میں امیرِ ملت نے اُسے مخاطب کیا: "سید صاحب! میرے قریب آ کر بیٹھیے۔" سید جماعت علی کو حیرت ہوئی، انھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں سید ہوں؟ وہ اُن کے پاس جا بیٹھا۔ امیرِ ملت شفقت و محبت سے اُس کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ اُس نے فرمائش کی: "کوئی کرامت دکھائیے۔" امیرِ ملت مسکرا کر رہ گئے۔ پھر گاڑی دریائے بیاس کے پُل پر پہنچ گئی۔ امیرِ ملت نے یکایک جماعت علی سے کہا: "سید صاحب! گاڑی رُک گئی ہے، زحمت تو ہو گی، لوٹے میں دریا سے پانی بھر لائیے۔ جاری دریا کا پانی پاک ہوتا ہے۔" جماعت علی نے محسوس کیا کہ گاڑی واقعی پل کے پاس کھڑی ہے مگر اُسے ڈر تھا، کہیں چل نہ پڑے۔ امیرِ ملت نے کہا: "جلدی جا کر بھر لائیے۔ گاڑی نہیں جائے گی۔" جماعت علی نے مجبوراً اُتر کے دریا سے لوٹا بھرا اور اُسے امیرِ ملت کے حوالے کر کے اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ گاڑی پہلے جیسی تیز رفتاری سے بیاس کا پل پار کر رہی تھی۔ وہ جالندھر پہنچ کر رُکی۔ جماعت علی نے اسٹیشن پر اُتر کے ریلوے والوں سے دریافت کیا: "ریل دریائے بیاس کے پل پر کیوں رُکی تھی؟" سب نے اُس کی ہنسی اُڑائی: "بھائی میرے! یہ ڈاک گاڑی ہے، بڑے بڑے اسٹیشنوں پر نہیں رُکتی، پل پر کیوں رُک جاتی؟"

ایک بار امیرِ ملت کے کچھ مخالفوں نے اُن سے کہا: "جماعت علی! تم سید نہیں ہو۔ سیدوں کو آگ نہیں جلاتی، اگر تم واقعی سید ہو تو ہم آگ جلاتے ہیں، اُس پر چل کے دکھاؤ۔" امیرِ ملت نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ ایک وسیع جگہ آگ بھڑکائی گئی۔ معلوم ہوتا تھا: دوزخ کا کوئی دہکتا ہوا حصہ زمین پر آ گرا ہے۔ آگ کی تپش سے ہجوم پیچھے ہٹتا جاتا تھا۔ امیرِ ملت نے بے خطر جوتے اُتارے اور آگ میں داخل ہوتے ہوئے بلند آواز سے کہا: "جو بھی چاہے ہمارا دامن پکڑ لے اور آگ میں چلا آئے۔" بارہ باجماعت اُن کے

سب بگم

ساتھ آگ میں داخل ہو گئے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

ایک مرتبہ ملتان کے کوئی مولوی صاحب امیرِ ملت کے پاس آئے انھوں نے سوچا امیرِ ملت کے اخراجات کس طرح پورے ہوتے ہوں گے یہاں تو بادشاہوں جیسا دربار اور شاہوں جیسی دریا دلی ہے، سب کی تواضع پُرتکلف کھانوں سے کی جاتی ہے۔ یکایک امیرِ ملت نے ملتان کے مولوی صاحب کو اپنے قریب بلایا اور اُن کا سر پکڑ کے اپنے قدموں میں جھکا دیا مولوی صاحب نے عجب منظر دیکھا۔ وہ تنہا کھڑے تھے۔ سونے چاندی اور لعل و جواہر کا ایک بڑا خزانہ اُن کے اردگرد بکھرا ہوا تھا۔ مولوی صاحب یہ منظر دیکھ کے بے ہوش ہو گئے۔ بعد میں وہ امیرِ ملت سے معافی مانگ کے اُن کے مریدوں میں شامل ہوئے۔

علی پور سیداں کی مسجدِ نور امیرِ ملت نے اپنے صرفِ خاص سے تعمیر کرائی تھی۔ وہ خود بھی مزدوروں کے ساتھ دن رات کام کرتے محنت و مشقت میں کبھی کمی نہ آتی۔ عقیدت مند منع بھی کرتے "سرکار، غلام حاضر ہیں، آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں" امیرِ ملت آب دیدہ ہو کے کہتے: "جو کام میرے کالی کملی والے بادشاہ نے کیا ہو، اُس سے مجھے منع نہ کیا کرو۔" وہ بوجھ اُٹھا اُٹھا کر راج کو دیتے اور فرش اپنے ہاتھوں سے رگڑتے۔ مسجد ہر اعتبار سے پُرشکوہ بنی۔ اس کی لاگت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، لاکھوں روپے کا تو سنگِ مرمر ہی استعمال ہوا ہے۔ جو بھی علی پور سیداں آتا، امیرِ ملت اس سے کہتے "مسجدِ نور میں نماز ادا کر کے جانا۔"

انگریز آقا کے خلاف غلام ہندوستان کی جدوجہد میں امیرِ ملت اپنے ہم وطنوں کے شانہ بشانہ تھے۔ اُن کا تعلق مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی خلافت تحریک سے تھا۔ ایک مرتبہ مولانا شوکت علی نے اہلِ وطن سے خلافت فنڈ میں فی خاندان ایک روپیہ چندہ دینے کی اپیل کی۔ امیرِ ملت نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ "اٹھو! اِس اپیل پر سب سے پہلے لبیک کہو۔" صرف چندھن میں ایک لاکھ روپے جمع کر کے علی برادران کو بھیج دیے گئے۔

ایک بار لائل پور میں یہ افواہ اُڑ گئی کہ پیر جماعت علی شاہ علی برادران کے ساتھ نہیں رہے۔ امیرِ ملت نے بھرے جلسے میں اعلان کیا "خلافت تحریک میرے لیے ایک جہاد ہے۔ اس تحریک پر چلنے والی پہلی گولی میرے سینے پہ لگے گی۔ میری نسبت یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میں انگریز سے ڈرتا ہوں۔ ڈرے وہ جسے دنیا اور دنیا کی چیزوں کا خیال ہو۔" انھوں نے مجمع سے سوال کیا: "مجھے بتاؤ۔ کیا پورے ہندوستان میں صرف مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی رہ گئے ہیں جو وطن کے لیے تکلیفیں اٹھائیں اور جیل جائیں؟ کیا باقی ہندوستانی مر گئے؟ کیا تم میں غیرت نہیں؟ غیرت نہیں؟ سُن لو جس میں غیرت نہیں اس میں کچھ نہیں۔" لاہور کے مشہور سرکاری اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ نے لکھا تھا: "انگریز حکومت کو کسی لیڈر سے اتنا خطرہ نہیں جتنا پیر جماعت علی شاہ سے ہے۔" حقیقت بھی یہی ہے۔ امیرِ ملت کی ایک للکار پر ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے اُن کے مرید گھروں سے نکل آتے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد اتحادی طاقتوں نے اسلامی اتحاد پارہ پارہ کر دیا تھا۔ مسلمان مرتد ہو ہو کے دوسرے مذاہب میں شامل ہو رہے تھے۔ امیرِ ملت نے لاہور کے ایک جلسے میں اعلان کیا کہ "میں جب تک مرتدوں کو اسلام کے حلقے میں دوبارہ داخل نہیں کر لوں گا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

۱۹۴۰ء میں قراردادِ لاہور منظور ہوئی۔ امیرِ ملت نے اُس کی زبردست حمایت کی اور کہا کہ "میں اُس شخص کا جنازہ نہیں پڑھاؤں گا جس نے کسی نہ کسی پہلو سے تحریکِ آزادی میں حصہ نہ لیا ہو۔" ۱۹۴۳ء میں قائدِ اعظم پر چاقو سے حملہ ہوا۔ امیرِ ملت نے انھیں لکھا کہ "آزادی کے لیے آپ جو کوشش کر رہے ہیں وہ میرا کام تھا لیکن میری عمر سو سال سے زیادہ ہو چکی ہے، میرا بوجھ آپ پر آ پڑا ہے لہٰذا میں آپ کی امداد کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں لیکن آپ بھی عہد کیجیے کہ اپنے مقصد سے کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔" قائدِ اعظم نے جواب میں لکھا: "میں اپنے مقصد میں ابھی سے کامیاب ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

ایک بار مانکی کے پیر علی پور سیداں آئے۔ شدید سردی پڑ رہی تھی اور تیز پانی برس رہا تھا۔ مانکی کے پیر صاحب کے ساتھ رفقا اور بندوقیں لیے محافظ بھی تھے۔ اسٹیشن سے یہ قافلہ پیدل امیرِ ملت کی خانقاہ پہنچا۔ امیرِ ملت نے آہٹ سن کر پوچھا "کون؟" پیر صاحب نے جواب دیا "مانکی کا فقیر" امیرِ ملت اُٹھ کے کھڑے ہو گئے "آج تو فقیر کے گھر بادشاہ آ گیا۔ پیر صاحب! آپ نے اطلاع تو دی ہوتی۔ اِس سردی اور تاریکی میں اسٹیشن سے یہاں تک آنے میں آپ کو کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔" مانکی کے پیر بولے "شرمندہ نہ کیجیے۔ کاش میں مانکی سے علی پور سیداں پیدل اور ننگے پیر حاضر ہو سکتا۔" امیرِ ملت نے انھیں تپاک سے بٹھایا اور ملازم کو کھانا لانے کا حکم دیا۔ مہمان نے کہا "میں رات کو کھانا نہیں کھاتا۔" امیرِ ملت بولے "آج تو کھانا ہوگا۔" مہمان نے سب رنگ

بتایا: "چالیس سال سے میری عادت ہے کہ رات کو کچھ نہیں کھاتا۔" امیرِ ملت نے برجستہ کہا: "میری سو سال سے عادت ہے کہ مہمان کو بھوکا نہیں سونے دیتا۔" مانکی کے مہمان تین دن تک امیرِ ملت کے ساتھ رہے۔ انھیں رخصت کرتے وقت امیرِ ملت نے ترغیب دی کہ قائدِ اعظم کا بھرپور ساتھ دیجیے۔

مانکی میں ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا۔ قائدِ اعظم کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ امیرِ ملت نے اس موقع پر سونے کا ایک تمغہ قائدِ اعظم کے لیے روانہ کیا۔ مانکی کے پیر صاحب نے امیرِ ملت کے فرستادے کی انتہائی عزت کی اور جلسے کی صدارت انھی سے کرائی۔ قائدِ اعظم ڈائس پر آ کے بیٹھے تو امیرِ ملت کے فرستادے نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ "امیرِ ملت پیر جماعت علی شاہ صاحب نے آپ کے لیے کامیابی کا تمغہ بھیجا ہے۔" قائدِ اعظم مسرت سے کھڑے ہو گئے: "آج میں سچ مچ کامیاب ہو گیا۔ براہِ کرم یہ تمغہ میرے سینے پر آویزاں کر دیجیے۔"

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں امیرِ ملت نے یہ فتوا جاری کیا کہ "جو شخص مسلم لیگ کو ووٹ نہ دے، اُس کا جنازہ نہ پڑھو اور اُسے اپنے قبرستان میں دفن مت ہونے دو۔" مسلم لیگ انتخاب جیت گئی۔ قائدِ اعظم نے امیرِ ملت کو تار دیا: "آپ کی دعائیں پاکستان کی سرحدیں بن گئی ہیں۔" امیرِ ملت نے جواب میں لکھا: "مسلمانوں کو اُن کے نئے وطن کی سرحدیں مبارک۔"

پاکستان بن گیا تو امیرِ ملت نے قائدِ اعظم کو لکھا: "یاد رکھنا، ملک گیری آسان ہے، ملک داری مشکل۔ کاش، تمھیں ملک داری کی توفیق حاصل ہو۔"

تیرھویں مئی ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے۔ امیرِ ملت نے لوگوں سے کہا: "لوگو! ہم سے جلدی جلدی آ کر ملا کرو۔ کل ایک خط میرے پاس آیا ہے۔ اُس میں لکھا ہے: تمھاری زندگی اب بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ خوب عبادت کیا کرو۔" ایسی گفتگو امیرِ ملت نے پہلی بار کی تھی، لوگ سکتے میں رہ گئے۔ امیرِ ملت مسکراتے ہوئے بولے: "موت کا کیا ڈر، موت پر کیا رونا۔ ایک روز سبھی کو مرنا ہے۔" اُن سے پوچھا گیا: "حضرت! وہ خط کہاں ہے؟" امیرِ ملت نے جواب دیا: "حیدر حسین کے پاس ہے، منگوا لو۔" خط منگوایا گیا، عربی میں تھا۔ امیرِ ملت نے کہا: "پڑھو۔ مجھے بھی سناؤ، ترجمہ بھی کرو تاکہ دوسرے لوگ بھی سمجھ سکیں۔" خط شروع کیا گیا، ترجمہ بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہا۔ خط پڑھنے والے نے امیرِ ملت سے کہا: "حضور! اس خط کی عربی غلط ہے اس لیے اِس کی اطلاع بھی غلط ہو سکتی ہے۔" امیرِ ملت

سنجیدہ

سنجیدہ ہو گئے: "مجھے کسی نے غلط اطلاع سو سال تک کیوں نہیں دی؟" معترض نے کہا: "بہرحال حضور خود غور فرمالیں، خط کی عربی غلط ہے۔" امیرِ ملت نے سمجھایا: "غلط نہ کہو۔ یہ خط قدیم عربی میں تحریر کیا گیا ہے۔ ویسے عربی قدیم ہو یا جدید، اطلاع صحیح ہے۔"

علی پور سیداں میں سخت گرمی تھی۔ امیرِ ملت گرمیوں میں عموماً مری یا کسی اور ٹھنڈے مقام پر چلے جاتے تھے لیکن اس سال انھوں نے اعلان کر دیا تھا کہ "اب علی پور سیداں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔" رمضان کو انھیں بخار آ گیا۔

انھی دنوں ایک عورت بیعت کے لیے آئی۔ امیرِ ملت طالبوں کو سلسلے میں خود داخل کرتے تھے لیکن اُس دن عورت سے کہا: "مسجد میں بڑے لڑکے کے پاس چلی جا۔" عورت نے ضد کی: "حضور! میں تو آپ ہی کے ہاتھ پر بیعت کروں گی۔" امیرِ ملت نے کہا: "ماں! جو تو نہیں جانتی، وہ میں جانتا ہوں۔ مسجد چلی جا۔" عورت چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ رخصت ہونے کے لیے دوبارہ امیرِ ملت کے پاس آئی۔ امیرِ ملت نے دریافت کیا: "دیکھ آئی؟ کچھ دیکھا؟" عورت نے لرزتی آواز میں جواب دیا: "آپ نے سچ کہا، آپ نے سچ کہا۔"

آخری دن اُن کے حکم پر مہمانوں کو کھانا کھلا دیا گیا۔ لوگوں کے اصرار پر انھوں نے ذرا سی فیرنی کھائی اور صابن سے بار بار ہاتھ دھوئے، پھر کہا: "افضل حسین سے کہو، عشا کی جماعت جلد پڑھا دے۔ آج مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

باجماعت نماز کے بعد انھوں نے لوگوں سے کہا: "مجھے نیچے لے چلو۔" انھیں نیچے لا کر لٹا دیا گیا۔ غنودگی میں انھوں نے فرمائش کی: "میری تسبیح دو۔" تسبیح دے دی گئی۔ انھوں نے معمول کے مطابق اوراد و وظائف پورے کیے اور تسبیح واپس کرتے ہوئے پوچھا: "ساتھ والے کمرے میں کون ہے؟" بتایا گیا، گھر کی خواتین ہیں۔ امیرِ ملت بولے: "اُن سے کہا جائے، اطمینان سے زنان خانے میں جائیں۔ اب مجھے آرام ہے۔ آرام ہی آرام۔" وہ خاموش ہو گئے۔ لوگوں نے جھک کر اُن کا چہرہ دیکھا، پھر نبض دیکھی۔ سوا سو سال کی بے قراری کو قرار آ چکا تھا۔ امیرِ ملت پیر جماعت علی شاہ ۳۰، ۳۱ اگست ۱۹۵۱ء کی درمیانی شب گیارہ بجے اس دنیا سے چلے گئے۔

امیرِ ملّت کے ساتھ ایک دلچسپ سفر

شیخ عبدالشکور لاہوری

ایک مصنف کا مقولہ ہے کہ "زندگی میں دراصل وہی لمحے شمار کے قابل ہیں جو کہ گزر چکے ہیں۔" اس مقولہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر وہ لمحے خدا تعالیٰ کے کسی برگزیدہ بندے کی صحبت میں گزرے ہوں تو ان کی یاد ایک ایسا خزینہ ہے جو گنجِ شائگاں سے کم نہیں۔

تقریباً نصف صدی[1] کی بات ہے کہ مجھ گنہگار کو اپنے پیر و مرشد قبلہ حضرت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب علی پوری کی معیت میں ایک سفر کرنے کا شرف حاصل ہوا، اب جبکہ ہماری زندگی کے چمن میں لالہ و گل کا فروغ ختم ہوتا نظر آرہا ہے تو ان مبارک لمحوں کے وجدانی کیفیات کی یاد ہمارے نہاں خانۂ دل میں روشنی پیدا کرتی ہے۔

اپنے ایک بزرگ شیخ محمد امین صاحب رئیس قصور کے فرزند شیخ محمد اصغر کی شادی کی تقریب میں مجھے لاہور سے سیالکوٹ جانا ہوا۔ چونکہ مجھے قبلۂ عالم سے بھی ایک ضروری کام کے ضمن میں ملنا تھا تو میں آنجناب کا پتہ لینے کے لئے سیدھا اپنے بزرگ ماسٹر کرم الٰہی صاحب ایڈووکیٹ مرحوم (خلیفۂ مجاز) کے مکان پر پہنچا تو انہوں نے مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا اور بہت تواضع کی۔ اس سائنسی دور میں ایسے مشفق بزرگ اور مخلص دوست کا ملنا کہاں نصیب ہو سکتا ہے؟ انہوں نے میرا اسباب اپنے ہاں

---

[1] یہ مضمون ۱۹۶۲ء میں لکھا گیا تھا۔ (قصوری)

اتفاق حسنہ سے
دکھوالیا اور یہ امید بھی دلائی کہ قبلۂ عالم کے سیالکوٹ آنے کی امید ہے! اتفاق حسنہ سے
دوسرے ہی روز یہ معلوم ہوگیا کہ قبلۂ عالم سیالکوٹ تشریف لے آئے ہیں اور "جماعت منزل"
میں فروکش ہیں، میں رسمِ نکاح خوانی سے فارغ ہوکر جماعت منزل کی طرف رواں دواں
چلا، وہاں پہنچکر کیا دیکھتا ہوں کہ خلقت کا بے پناہ ہجوم حضرت صاحب کو گھیرے
ہوئے ہے اور ان تک پہنچنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، اس وقت نعت خوانی ہو رہی
تھی اور پنجاب کے مشہور نعت گو راقب قصوری کی ایک نعت میاں جلال جھوم جھوم کر
پڑھ رہے تھے ؎

جے دل نیڑے تنے روضہ دور کی اے
نی خبرے اوس نوں منظور کی اے

جلال کی جوانی کا زمانہ تھا، پھر اس کی آواز میں بلا کا سوز تھا، جب مصرعہ اٹھاتا
تو یوں معلوم ہوتا کہ موسیقی آسمان سے اتر رہی ہے اور "شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو"
والی بات ہو رہی ہے۔ جب سامعین کے اصرار پر ع
نی خبرے اوس نوں منظور کی ہے
دہراتا تو سامعین کے دل کی حالت دگرگوں ہو جاتی اور کئی حضرات زمین پہ لوٹنے لگتے
پھر جب اس نے یہ شعر پڑھا ؎

توں پردہ پوش او گنہاریاں دا
لنگھا دے پار، پہلے پور، کی اے

تو گویا قیامت ہوگئی، ایسا سماں ہم نے کاہے کو کبھی دیکھا تھا، خلقت اشکبار ہو کر اس
شعر کو مکرر بعد مکرر پڑھنے کا اصرار کرتی اور قبلہ حضرت صاحب فرطِ جذبات سے بیخود
ہو جاتے تھے اور اسی شعر کے مکرر پڑھنے کا حکم دیتے، غرضیکہ یہ سلسلہ دیر تک رہا۔
اس نعت کے بعد ایک اور ہندوستانی شاعر نے اپنی نعت سے خوب رنگ جمایا۔

اس طرح رات کے دو بج گئے، قبلۂ عالم نماز تہجد کے لئے کھڑے ہو گئے اور ہم با دلِ ناخواستہ گھر لوٹے۔

ایسے پُرکیف سماں میں مجھے یہ بالکل یاد نہ رہا کہ میں حضور کی خدمت میں کس مقصد کے لئے حاضر ہوا تھا البتہ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جنابِ والا صبح کی ٹرین سے راولپنڈی جا رہے ہیں۔

حضرات آج سے چالیس پچاس برس پہلے کے موسم سرما کا کیا ذکر کیا جائے کہ کس کڑاکے کی سردی پڑتی تھی خصوصاً ماہِ دسمبر و جنوری میں تو شمالی ہندوستان کُرۂ زمہریر بن جاتا تھا۔ جب صبح کو ۸ بجے اسٹیشن پر پہنچا تو سردی سے دانت بج رہے تھے مگر اس سردی کے باوجود بھی بہت سے لوگ حضرت صاحب کو رخصت کرنے کے لئے سٹیشن پر موجود تھے اور ان کے ڈبے کو گھیرے ہوئے تھے۔ آخر بہزار دقت میں آنجناب کے قریب پہنچا اور اپنا مقصد بیان کیا، اس پہ حضور نے فرمایا:-

"آج دوپہر کا کھانا وزیر آباد کے ثمن بُرج میں راجہ اکرام اللہ خاں کے ہاں ہے، تم وہاں تک ہمارے ہمراہ چلو، کھانے کے بعد تمہیں تعویذ لکھ دیں گے۔"

چنانچہ تعمیلِ ارشاد کے لئے میں بھی قبلۂ عالم کے ہمراہ وزیر آباد چلا گیا۔

راجہ اکرام اللہ خاں مرحوم، وزیر آباد کے ایک جلیل القدر رئیس تھے، ان کے والد صاحب کرنل راجہ عطاء اللہ خاں راجوڑی (ریاست کشمیر) کے رئیس تھے سکھ چند وجوہ کے باعث وہاں سے چلے آئے اور وزیر آباد میں اقامت پذیر ہوئے تھے، راجہ اکرام اللہ خاں صاحب گوناں گوں صفات کے مالک تھے اور اپنی فیاضی اور خوش خلقی کے باعث بہت ہر دلعزیز تھے۔ جب ٹرین وزیر آباد پہنچی تو سٹیشن پر ایک ہجوم استقبال کے لئے موجود تھا۔ راجہ صاحب موصوف اور ان کے عزیز دل

نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور جلوس کی صورت ثمن برج پہنچے، اس ضمن میں یہ بتانا بھول گیا کہ اس سفر میں صاحبزادہ سید خادم حسین مرحوم اور جناب صاحبزادہ سید نور حسین شاہ صاحب[1] بھی ہمراہ تھے نیز شیخ عبدالرحمٰن صاحب پلیڈر (ریلوے) کے علاوہ مولانا غلام احمد صاحب[2] اخگر، سابق مدیر انوار الصوفیہ بھی ہمراہ تھے اور ان متذکرہ حضرات کے دم قدم سے یہ سفر ایک نورانی مجلس اختیار کر گیا تھا جس کی شان ہمارا دل ہی جانتا ہے۔

ثمن برج، دریائے پلکھو کے کنارے ایک قلعہ کی صورت میں بنا ہے، وہاں ایک پرتکلف دعوت کا انتظام تھا جس میں تقریباً دو سو حضرات نے شرکت کی۔ دعوت سے فارغ ہو کر نعت خوانی شروع ہو گئی جو تین بجے تک رہی۔ قبلۂ عالم نے بعد دوپہر کی گاڑی سے راولپنڈی جانا تھا اس لئے میں نے ان کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے اب رخصت فرمایا جائے اور تعویذ عطا کئے جائیں۔ اس پر آنجناب ہنس پڑے اور فرمایا:۔

"اب تو تعویذ لکھنے کے لئے وقت نہیں رہا، بہتر ہوگا کہ تم راولپنڈی تک ہمراہ چلو تو وہاں تم کو فارغ کر دیا جائے گا۔"

میں لاہور سے زیادہ نقدی لیکر نہ چلا تھا کیونکہ فقط سیالکوٹ کا سفر ہی تو درپیش تھا۔ اب راولپنڈی کی آمد و رفت کا کرایہ موجود نہ ہونے کے باعث میں کچھ پریشان ہو رہا تھا مگر حضورِ انور میری پریشانی کو بھانپ گئے اور بہت پیار سے فرمانے لگے۔

"او ئے شکور! کرایہ کی کیا فکر کرتا ہے تو ٹرین میں ہمارے ساتھ ہی بیٹھ جانا تمہیں کوئی نہ پوچھے گا۔"

اندھے کو تو دو آنکھیں چاہئیں، ہماری بھی لااُبالی کا زمانہ تھا۔ ہم خوشی خوشی

---

[1] فرزندانِ امیرِ ملت قدس سرہ۔

[2] خلیفۂ امیرِ ملت۔ ان حضرات کے حالات کیلئے احقر کی کتاب "خلفاءِ امیرِ ملت" دیکھئے۔ (نقوی)

سیکنڈ کلاس میں حضرت صاحب کے ساتھ براجمان ہو گئے اور ٹرین راولپنڈی کی سمت ہو گئی۔ گجرات، جہلم اور گوجر خاں کے سٹیشنوں پر خوب آؤ بھگت ہوتی رہی اور یاران طریقت پھولوں کے ہار، پھل اور پستہ بادام لیکر موجود ہوتے تھے۔ ادھر صاحبزادہ خادم حسین صاحب کو مجھ عاجز سے جو محبت تھی اس کے زیر اثر وہ لوگوں سے فرما دیتے کہ یہ بھی صاحبزادہ ہے تو حضرت! ہماری بھی خوب قدر ہونے لگی اور لوگ مجھ حقیر کے بھی ہاتھ چومنے لگے اور ہم پھولے نہ سماتے تھے کہ یہ سعادت اپنے پیر کی طفیل نصیب ہوئی۔

جب ہم راولپنڈی پہنچے تو عجیب سماں دیکھا۔ ٹرین کے نیچے پٹاخے چلنے شروع ہوئے اور نعرہ تکبیر کی صداؤں سے سٹیشن گونج رہا تھا۔ صاحبزادگان والا تبار کے علاوہ مجھ حقیر کے گلے میں بھی ہار پڑنے لگے اور اپنی بے بضاعتی کے احساس کے باعث میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ فٹن گاڑیوں اور تانگوں کے ایک جلوس کی صورت میں ہم اپنے ایک پیر بھائی صوبیدار میجر شاہنواز کے مکان پر پہنچے جو کہ صدر بازار میں واقع تھا، وہاں کئی دیگیں تیار تھیں اور بہت سے لوگوں نے کھانا حضرت صاحب کے ساتھ تناول کیا، بعد نماز عشاء نعت خوانی شروع ہوئی جو کہ دیر تک جاری رہی اور میں لاہور آنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ آخر حضور والا کی خدمت میں تعویذوں کے لکھنے کی التجا فرمائی، اس پر حضرت قبلۂ عالم ہنس پڑے اور فرمایا:-

• ارے بے وقوف! اب تو چورہ شریف کے نزدیک پہنچ گیا ہے اور تیری بدقسمتی ہو گی کہ تو میرے مرشد کے مزار کی زیارت کئے بغیر واپس چلا جائے، تو روپے پیسے کی فکر کرتا ہے، تیرا سب کرایہ ہم دیں گے۔"

سبحان اللہ! مجھ عاجز اور حقیر پر کس قدر شفقت اور نوازش تھی چنانچہ میں بے فکر ہو گیا اور جامے میں پھولا نہ سماتا تھا چنانچہ رات کے دو بجے گاڑی میں سوار ہوئے

اور صبح پانچ بجے سٹیشن لنگر پر پہنچ گئے۔

راولپنڈی سے چلتے وقت چند ایک پشاوری یار بھی ساتھ ہوئے تھے یعنی غلام رسول خاں لنگی فروش، محمد شفیع خاں کلرک آف کورٹ اور ان کے بھائی محمد رفیق خاں نیز دو تین اور بزرگ بھی تھے جو کہ سب ہنس مکھ اور اپنے پیر کے فدائی اور گرویدہ تھے۔ جب ہم گاڑی کے بند ڈبہ سے باہر نکلے تو بلا کی سردی پڑ رہی تھی اور ہمارا دم اکھڑ رہا تھا۔ آخر بھائی غلام رسول نے وہیں سماوار گرم کیا اور چائے کی ایک ایک پیالی سے ہمارے ہوش کچھ ٹھکانے ہوئے۔

ہم گنہگاروں کا تو سردی سے یہ حال تھا مگر ادھر قبلہ حضرت صاحب کی یہ کیفیت کہ جیسے سردی محسوس ہی نہیں ہو رہی۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر اپنی نعلین اتار دیں اور ننگے پاؤں اپنے مرشد کے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ یہ ایسا عجیب منظر تھا کہ جس پر ہم سب حیران تھے مگر آپ نے جذبۂ عشق کی حرارت سے یہ سفر انہوں نے ہنسی ہنسی اور باتوں میں ختم کر لیا اور ذرا بھی تکلیف محسوس نہ کی۔ ہم چورہ شریف میں عین اس وقت پہنچے جبکہ سورج کی ٹکیہ افقِ مشرق سے نمودار ہو رہی تھی اور وہاں کے بزرگان اور صاحبزادگان سفید لباس میں ملبوس ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے انہوں نے گلے مل مل کر ہمیں دعائیں دیں اور دیوان خانہ میں صبح کا ناشتہ کیا۔

اس ضمن میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ جب ہم نے چورہ شریف کے بزرگوں کے پاس اس بات کا ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ ہمارے قبلۂ عالم کا ننگے پاؤں سفر کرنا تو کچھ حقیقت نہیں رکھتا کیونکہ آنحضور نے تو اس سے بھی زیادہ مشقتیں جھیلی ہوئی تھیں منجملہ ایک یہ کہ جب حضرت باباجی صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر سفر پہ جایا کرتے تھے تو ہمارے قبلۂ عالم پا پیادہ ان کے ہمراہ چلا کرتے تھے اور بعض اوقات جب گھوڑا

بھاگنے لگتا تو آپ بھی ہمراہ ہی بھاگتے اور اس طرح میلوں بھاگتے رہتے ، نہ معلوم کیسی کیسی ریاضتیں اور نفس کشی کی کتنی منزلیں آنجناب نے طے کی تھیں تب کہیں جاکے یہ مقام حاصل کیا کہ خاصانِ خدا میں شامل ہوئے اور مرگی کے مریضوں اور دیوانوں کو ایک دو مرتبہ دم کرنے سے ہی شفا ہوتی ۔ چنانچہ میرے ایک خالوزاد بھائی مرگی کے مرض میں مبتلا تھے اور ان کے والدین سخت پریشان تھے ۔ میرے والد مرحوم اس مریض کو قبلہ حضرت صاحب کی خدمت میں لے گئے اور خدا کے فضل اور حضور کی دعا کی برکت سے مرض ہمیشہ کے لئے جاتا رہا ۔

جس دن ہم چورہ شریف پہنچے اسی دن قبلہ باباجی صاحب کا سالانہ عرس تھا اور دور و نزدیک سے خلقت جوق در جوق آرہی تھی ۔ سبحان اللہ کیا پُر نور سماں تھا ۔ چاروں طرف سے لوگ نعتیں پڑھتے اور سبز جھنڈے لہراتے جلوس کی صورت میں آرہے تھے خصوصاً علاقہ کوہاٹ وغیرہ سے جو جلوس آیا وہ قابلِ دید تھا ، خوش رو اور قدر آور پٹھان پشتو میں نعت خوانی کرتے چلے آرہے تھے اور دلوں پر عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی ۔

اب عرس شروع ہوا ۔ سب سے پہلے صاحبزادگان والا تبار نے قرآنِ مجید کے رکوعات اس خوش الحانی سے سنائے کہ محفل سراپا نورانی مجلس بن گئی اور اللہ تعالےٰ کی برکات و فیوض کی بارشیں ہوتی نظر آتی تھی پھر میاں جلال نعت خوان نے ایک نعت پڑھی جس کا ایک بند ملاحظہ ہو ـــ

میں قربان کیتی ادی مکی مدنی ماہی توں ۔۔۔ میں قربان
دل وچہ کلمہ ، ہتھ وچہ جالی
تاں میں ہوواں مراداں والی
اکھیاں اگے روضہ عالی

بھیک چنگیری شاہی توں
میں قربان کمینی ادنیٰ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس نعت سے ایسا رنگ جمایا کہ کئی لوگ مرغ بسمل کی طرح بے تاب ہو کر لوٹنے لگے اور ہر مصرعہ پر وجد کا زور بڑھنے لگتا، آخر یہ نعت آدھ گھنٹہ میں ختم ہو گئی۔

اس زمانہ میں حافظ خلیل الدین احسن المتخلص بہ حافظ پیلی بھیتی کا کلام پنجاب میں بہت مقبول ہو رہا تھا اور مجھے بھی ان کی دو چار نعتیں یاد تھیں جنہیں میں دوستوں کی مجالس میں کبھی کبھی پڑھ دیا کرتا تھا۔ چورہ شریف کے نورانی ماحول سے متاثر ہو کر مجھے بھی یہ جرأت ہوئی کہ میں ایک نعت پڑھوں، میری جوانی کا زمانہ تھا اور خدا کے فضل سے گلا بھی رسیلا پایا تھا چنانچہ میں نے کھڑے ہو کر نعت پڑھنی شروع کی، ایک تو حافظ کا کلام، دوسرے وہاں کا پاکیزہ ماحول، ایسا سماں بندھا کہ میرے گلے میں ہار پڑنے شروع ہوئے اور خود قبلۂ عالم بھی مجھے داد دیتے تو میرا دل بڑھنے لگتا، مطلع ملاحظہ ہو ؎

قرب موسیٰ اور ہے معراج مولیٰ اور ہے
طور سینا اور ہے عرش معلیٰ اور ہے

اس شعر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برتری جس لطیف انداز سے بیان کی گئی ہے، وہ لاجواب ہے۔ سب نے دل کھول کر داد دی، جب میں نے دوسرا شعر پڑھا تو محفل لوٹ گئی ؎

سب کا منہ کعبے کو ہے، کعبے کا روضے کی طرف
سب کا قبلہ کعبہ ہے، کعبے کا قبلہ اور ہے

پھر جب یہ شعر پڑھا ؎

جس کو ہو گا اس کو ہو گا شہرِ مولےٰ منزلوں
جس سے پل میں پہنچتے ہیں وہ رستہ اور ہے

تو قبلہ حضرت صاحب بے تاب ہو گئے اور کئی بار مجھے یہی شعر پڑھنے کا حکم دیا، ادھر خلقت کی طرف سے وہ بے پناہ داد ملی کہ میں اس کے بار سے دبا جا رہا تھا۔

پھر جب یہ شعر پڑھا تو کیسے بتاؤں کہ سب کی کیفیت کیا ہوئی اور کتنی بار یہ شعر پڑھا ملاحظہ ہو سے

سب گئے دیکھنے کو اِک میں پا شکستہ رہ گیا
اور واں پرسش کو کوئی آنے والا اور ہے

اس کے بعد ہمارے قبلہ حضرت صاحب کی خدمت میں التماس کی گئی کہ وہ اپنے موعظۂ حسنہ سے مستفید فرمائیں چنانچہ آنجناب نے وعظ شروع کیا جو ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔

وعظ کیا تھا بس انوار و فیوض کی بارش ہوتی معلوم دیتی تھی اور ایسے ایسے مؤثر نکات بیان فرمائے کہ خلقت ہر نکتہ پر نعرۂ تکبیر سے داد دیتی، پھر حجرہ شریف کے بزرگوں اور صاحبزادگان نے حضرت صاحب کو پھولوں کے ہار پہنائے اور ختم شریف کے بعد مجلس ختم ہوئی۔

نماز ظہر کے بعد قبلہ عالم اپنے مرشدِ طریقت کے مزار کے پاس پھر بیٹھ گئے اور حاجت مند لوگوں کا ہجوم ہونا شروع ہوا۔ دعا کرانے کی خاطر اور تعویذ حاصل کرنے کے لئے خلقت قبلہ حضرت صاحب پر ٹوٹی پڑتی تھی اور آنجناب بھی اس خضوع و خشوع سے دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے کہ سائل خوش ہو جاتا اور گونہ سکون ہو جاتا۔

تین چار مریض ایسے پیش ہوئے جو کہ مرض طحال (تلی) کے باعث درد سے بے تاب ہو رہے تھے۔ اب قبلہ حضرت صاحب نے صاحبزادہ غلام حسین صاحب

کو تو تعویذ لکھنے کی ہدایت فرمائی اور خود ایک تلوار منگوائی۔ تلوار آنے پر ان مریضوں کو فرش پر لٹا دیا گیا اور علیحدہ علیحدہ ان کے پیٹ پر رکھ کر وہ تلوار حضور والا دباتے رہے اور کچھ کلام پڑھتے رہے چند لمحوں کے بعد ان کو افاقہ محسوس ہونے لگا اور پیٹ کی سوجن کم ہونے لگی اور وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

اس کرامت سے متأثر ہو کر سب لوگ ان کے اور بھی گرویدہ ہو گئے اور لحظہ بہ لحظہ خلقت کا ہجوم بڑھتا گیا تا آنکہ نمازِ عصر کا وقت ہو گیا اور حضور نماز سے فارغ ہو کر اپنے وظیفہ میں مشغول ہو گئے۔

دوسرے دن بھی خلقت کا خوب ہجوم رہا اور وعظ، نعت خوانی کا سلسلہ گئی رات تک جاری رہا۔ تیسرے دن دوپہر کو سب مہمانوں کو کھچڑی پیش کی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ گرم گرم گھی علیحدہ کٹوروں میں پیش کیا گیا۔ قبلۂ عالم کی زبانی معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں رخصت کے دن یہی کھانا پیش کیا جاتا ہے۔ قبلۂ عالم کھانے کے ساتھ ساتھ کچھ چٹکلے اور مزاحیہ فقرے بھی فرماتے رہے جس سے کھانے کا لطف دوبالا ہو جاتا اور محفل کشتِ زعفران بن جاتی۔ ایک لطیفہ ملاحظہ فرمائیں:-

چورہ شریف کے ایک صاحبزادہ صاحب بہت پیار او خلوص سے مکھن کا ایک پیالہ لائے اور بہت ادب سے قبلۂ عالم کے سامنے رکھ دیا۔ اس پر آنجناب نے مذاقیہ انداز میں فرمایا کہ ایمان کی چیز تو اب آئی ہے۔ اس پر حاضرین ہنس پڑے۔ خیر کھانا جاری رہا۔ اب ایک بزرگ نے جو ہمارے ساتھ تشریف فرما تھے بے ساختہ اس پیالہ پر حملہ کر دیا اور نصف کے قریب مکھن نکال کر اپنی رکابی میں رکھ لیا۔ ان کی اس حرکت سے دیکھنے والے کچھ جز بز ہوئے مگر حضرت صاحب کی وجہ سے خاموش رہے لیکن شیخ عبدالرحمٰن بیرسٹر فنِ مکالمہ اور مزاحیات میں برق تھے، ان سے نہ رہا گیا اور بولے:-

"حضور! ہم تو چودہ شریف آکر ایمان سے خارج رہے"

اس پر قبلۂ عالم نے پوچھا کہ کیا بات ہے تو معاً بولے:-

"حضور! تمام ایمان تو ان حضرت نے چھین لیا تو اب ہمارے لئے کیا باقی رہ گیا؟"

اس پر ایسا بے پناہ قہقہہ پڑا کہ وہ حضرت شرم سے پانی پانی ہو گئے اور اپنی حرکت پر بہت خفیف ہوئے۔ بہر کیف ایک اور صاحبزادے نے مکھن کے دو پیالے اور لاکر ہمارے سامنے رکھے اور ہم بھی اپنے آپ کو با ایمان کہنے لگے۔

چونکہ اسٹیشن پر جانے کا وقت قریب آرہا تھا اس لئے میں نے قبلۂ عالم کو تعویذوں کے لئے یاد دہانی کرائی چنانچہ آپ نے تعویذ لکھنے شروع کئے اور مجھے تسلی ہو گئی کہ اب میں یہاں سے لاہور واپس چلا جاؤں گا۔

مگر حضرات! اب یوں ہوا کہ پشاور سے جو شفیق خاں اور ان کے بھائی ہمارے ہمراہ آئے تھے وہ میری نعت خوانی کے گرویدہ تھے، انہوں نے جب دیکھا کہ یہ شخص اب لاہور بھاگ رہا ہے تو مجھے علیحدہ لے جا کر سمجھایا۔ تم اب کوہاٹ چلو اور پھر وہاں سے قبلہ حضرت صاحب کے ہمراہ پشاور بھی ضرور چلو، وہاں ہم تمہاری خدمت کریں گے اور اگر تم نہ گئے تو ہم تمہیں چھرا مار دیں گے۔

ایک تو ان حضرات کے قد ساڑھے چھ فٹ کے تھے، دوسرے وہ قوی ہیکل بھی خوب تھے۔ یہ فقرہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے اور میں لرزنے لگا صاحبزادہ خادم حسین صاحب یہ کیفیت دیکھ رہے تھے اور مجھے خوفزدہ دیکھ کر ہنسنے لگے، پھر میرے پاس آکر میری دلجمعی کرنے لگے اور یہ فرمایا:-

"اگر تم کوہاٹ چلے چلو تو سب خوش ہو جائیں گے"

اس فقرے سے میری جان میں جان آگئی اور میں کوہاٹ جانے پر رضامند

ہو گیا۔ بعد میں یہ راز کھلا کہ یہ سب ترکیب ہمارے مشفق مہربان یعنی صاحبزادہ صاحب کی ہی تھی اور انہوں نے ہی ان پٹھانوں کو کہا تھا کہ کسی ترکیب سے تم عبدالشکور کو کوہاٹ تک لے چلو تاکہ وہاں بھی ذرا رونق ہو جائے۔ اب وہ لوگ تو پٹھان نسل کے تھے، وہ تو فقط چاقو چلانے کا ہی نسخہ جانتے تھے، وہی مجھ پر استعمال کرنے کا اظہار کر دیا اور میں نے ڈر کے مارے مان لیا۔ پھر صاحبزادہ صاحب نے حضور قبلۂ عالم کو بھی یہ بتایا کہ میں کوہاٹ چلنے پر رضامند ہو گیا ہوں تو آنجناب بھی بہت خوش ہوئے اور مجھے دس روپے بھی بطور انعام عطا فرمائے۔

ہم دو بجے چورہ شریف سے روانہ ہو کر شام کے قریب کوہاٹ چھاؤنی کے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ جب گاڑی سٹیشن پر رکی تو پٹھانوں کے ہجوم نے ہمیں چوطرفہ گھیر لیا نعرہ تکبیر اور زندہ باد کے نعروں سے سٹیشن گونج اٹھا۔ وہاں کے لوگوں کی عقیدت اور جوش کا یہ عالم تھا کہ پھولوں کے ہاروں کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاتھوں میں ایک ایک دو دو روپے بھی تھماتے رہے۔ قبلہ حضرت صاحب کے عطا کردہ دس روپوں کی برکت سے مجھ عاجز کی جیب میں بھی تیس چالیس روپے پہنچ گئے اور ہم اپنی خوش بختی پر پھولے نہ سماتے تھے۔

سٹیشن سے باہر نکلے تو پٹھانوں نے بندوقوں سے سلامی دی اور ایک میل لمبا جلوس شہر کی جانب روانہ ہوا۔ اس زمانہ میں موٹریں تو نہ تھیں اس لئے بہت سی فٹن گاڑیاں اور خوب سجے ہوئے تانگے پشاور سے منگوائے گئے تھے جس سے جلوس کی رونق دوبالا ہو گئی تھی۔

افغانستان کے دو شہزادے امیر عبدالرحمٰن والئ کابل کی سخت گیری سے خائف ہو کر عرصہ سے کوہاٹ میں مقیم تھے، وہ وہاں ایک نہایت شاندار کوٹھی میں رہا کرتے تھے جس کے طویل و عریض کمروں میں افغانی اور ایرانی قالین بچھے تھے اور چاروں طرف

گاڑی پہنچنے لگے تھے۔ ہمیں اس کوٹھی میں ٹھہرایا گیا۔ یہاں رات کو ایک پُرتکلف دعوت کا انتظام تھا۔ دعوت کے بعد یہاں بھی نعت خوانی شروع ہوگئی جو کافی دیر تک جاری رہی اور کئی لوگ عالمِ وجد طاری ہونے کے باعث بے ہوش رہے۔

دوسرے دن ہم نے شہر اور چھاؤنی کی سیر کی جہاں کئی دکانیں کرسمس کے باعث خوب سجی تھیں، پھر وہاں کے چشموں کا پانی پیا جو اپنی شیرینی اور خُنکی میں لاجواب تھا۔ قبلۂ عالم کی زیارت کے لئے اطراف واکناف سے بے شمار خلقت آگئی تھی اور ہجوم کے باعث ایک میلہ لگا معلوم دیتا تھا، پھر یہاں نعت خوانی اور درود وسلام سے عجیب سماں بندھ گیا تھا۔

بعد دوپہر بہت سے لوگ دعا اور تعویذوں کے لئے حاضر ہوئے، ان کے علاوہ کئی مریض بھی آئے جن کو حضورِ والا مناسب ہدایات دیتے رہے، پھر ایک ایسا مریض آیا جس کو چار آدمی سنبھالے ہوئے تھے اور وہ اپنی دماغی خرابی کے باعث بے قابو ہو رہا تھا۔ ہمارا قیاس یہ تھا کہ وہ شخص کسی آسیب میں مبتلا ہو کر دیوانہ ہو گیا ہے۔ حضرت صاحب کے قریب پہنچتے ہی وہ دیوانہ کچھ سنبھل گیا اور خاموش ایک طرف بیٹھ گیا جس پر سب حیران تھے۔ اس کے رفقاء نے اس کی حقیقت بیان کی کہ وہ عالمِ دیوانگی میں کس طرح لوگوں کو مارتا ہے نیز اینٹ اور پتھر مارنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

اب حضرت صاحب نے اسے اپنے سامنے بٹھا لیا اور اس کے سر پر ایک ہاتھ رکھ کر کچھ کلام پڑھنے لگے۔ کلام ختم ہونے کے بعد قبلۂ عالم نے یکایک ایک تھپڑ اس کے منہ پر زور سے مارا جس سے وہ ششدر رہ گیا مگر نہ تو وہ بولا اور نہ ہی کوئی حرکت اس نے کی۔ قبلۂ عالم نے پھر کچھ تعویذ لکھ کر اس کے لواحقین کو دئے

... اٹھا اور سلام کر کے روانہ ہوا۔ حضرت

صاحب کی اس کرامت سے خلقت پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوئی کہ کس طرح ایک دیوانہ کو منٹوں میں درست کر دیا۔

شام کے وقت کوہاٹ کے دو پٹھان رئیس حضرت صاحب سے ملنے کے لئے آئے اور دورانِ گفتگو دوسرے دن دعوت پر تشریف لانے کی استدعا کی جس کو حضور نے منظور فرما لیا چنانچہ دوسرے دن ہم ان خوانین کے گھر پہنچ گئے۔

ان کا مکان بھی بہت شاندار تھا۔ بڑے بڑے کمرے خوب سجے ہوئے تھے۔ ہم نے اپنی زندگی میں کئی پٹھانوں کو دیکھا ہے مگر ایسے طویل القامۃ اور بارعب انسان نہ دیکھے تھے، معلوم ہوا کہ یہ چار بھائی اس علاقہ کے رؤسا میں شمار ہوتے ہیں اور کافی زمینوں کے مالک ہیں۔

بہرحال جب ہم دوسرے کمرے میں دسترخوان پر جا کر بیٹھے تو رکابیوں کی بہتات اور کھانوں کی کثرت سے ہمارے ہوش پرّاں ہو گئے، بڑے بڑے روسی رکابیوں میں پلاؤ تھا جس کے اوپر چار چار سیخ کے کباب تھے نیز ساگ اور علاقہ تیراہ کے آلو دم تھے۔ ہم جیسوں کے لئے تو بس ایک ہی رکاب کافی تھی مگر اس کے علاوہ تین قسم کے اور سالن بھی تھے اور ہر ایک کے لئے ایک ایک مرغ علیحدہ تھا پھر زردہ اور زعفرانی پھرنی مزید براں۔ بہرکیف ہم نے کھانا شروع کیا۔ میرے سامنے شیخ عبدالرحمٰن تھے جو کہ بالکل عاشق تن تھے۔ ادھر دائیں طرف مولانا غلام احمد صاحب انگر تشریف فرما تھے جو کہ پچاس سے اوپر تھے۔ جب ہم نے پلاؤ کے تین چار لقمے اور دو سیخ کباب کھائے تو ہمارا پیٹ بھر گیا اور ہمارے ہاتھ کچھ رک گئے۔ وہ چاروں بھائی جن کی عقربی مونچھیں ہمیں خوفزدہ کر رہی تھیں مہمانوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ جب انہوں نے ہمارے ہاتھ چلتے نہ دیکھے تو ایک خان نے گرجدار آواز سے پوچھا :-

"خوچہ! تم کھانا کیوں نہیں سے ہے؟"

یہ سن کر ہمارے دل دہل گئے اور ہم نے پھر رکابی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کھانے لگے لیکن آخر ہم کیا کھاتے؟ بس دو نوالوں میں ہی ہمیں محسوس ہونے لگا کہ اگر ایک نوالہ بھی اور کھالیا تو ہم ابھی زمین دیکھنے لگیں گے لہذا ہم نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لئے اور خاموش بیٹھ گئے۔

اتنے میں ایک دوسرے خان نے ہمیں تاکا اور کہنے لگا :-

"خوچہ! تم اس طرح خاموش کیوں بیٹھے ہو؟ اگر تم کھانا نہیں کھائے گا تو زندہ کیسے رہے گا؟"

اس فقرہ پر قبلہ حضرت صاحب ہنس پڑے اور ان خوانین کو سمجھایا :-

"یہ لوگ لاہور کے رہنے والے ہیں اور بہت نفیس مزاج کے مالک ہیں اور زیادہ نہیں کھایا کرتے، آپ ان پر ناراض نہ ہوں بلکہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں"۔

بارے اس طرح ہماری جان بچی ورنہ ہمیں تو اندیشہ ہو گیا کہ کہیں یہ صاحب ہمیں چھرا ہی نہ مار دیں، بہرحال وہ خوانین حیران ضرور تھے کہ ہم بغیر سب کھانا کھائے زندہ کیسے رہ سکتے ہیں۔

دوسرے دن صبح کو نماز کے بعد ہی قبلۂ عالم سے رخصت طلب کی، اس پر جنابِ والا نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور پھر مجھے دس روپے بھی بطور سفر خرچ عنایت کئے مجھے ایک ریلوے افسر کے سپرد کیا کہ وہ مجھے راولپنڈی تک ہمراہ لے جائے اور وہاں سے لاہور کی ٹرین پر سوار کرا دے۔

بہرکیف ہم دوسرے دن بخیریت تمام اپنے گھر پہنچ گئے، یہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ میرے اتنے دن غائب رہنے اور خط نہ ملنے کے باعث سب عزیزان سخت پریشان تھے اور ہم عین اس وقت پہنچے جبکہ بریانی کی دو دیگیں ہماری والدہ صاحبہ ہمارے بخیریت گھر واپس آنے کی منت کے طور پر تقسیم کر رہی تھیں۔

(ماہنامہ انوار الصوفیہ قصور، جون ۱۹۶۲ء)

امیرِ ملّت سے ایک ملاقات

مولانا شریف احمد شرافت نوشاہی ساہنپال شریف (گجرات)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام

علیٰ سیدنا محمد وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین ؕ

اما بعد احقر العباد فقیر شریف احمد شرافت علوی عباسی قادری نوشاہی ساہنپالی (اصلح اللہ حالہ وقالہ) عرض کرتا ہے کہ میں اپنے ایک عزیز دوست منشی محمد رمضان کو ملنے کے لئے نارووال گیا۔ وہاں سے میں نے واپس پسرور کی طرف آنا تھا اور راستے میں علی پور سیداں بھی آتا تھا، ارادہ ہوا کہ وہاں نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگوں کو ملتا جاؤں چنانچہ بروز شنبہ بتاریخ چہارم صفر ۱۳۶۹ھ مطابق بست وششم نومبر ۱۹۴۹ء بوقت سات بجے صبح عزیز مذکور نے مجھے علی پور سیداں کے لئے ریل پر سوار کرا دیا۔ علی پور سیداں کے اسٹیشن سے تقریباً دو میل جانب جنوب مغرب موضع علی پور سیداں واقع ہے۔

یہاں ایک مشہور بزرگ حضرت حاجی حافظ پیر سید جماعت علی شاہ صاحب محدث سکونت پذیر ہیں جو نسباً شیرازی سادات سے ہیں اور عقیدۃً اہل سنت وجماعت حنفی المذہب ہیں اور مشرباً نقشبندی مجددی ہیں اور حضرت بابا فقیر محمد صاحب چوراہی کے اکابر خلفاء میں سے ہیں اور ان کا سلسلہ مریدین لاکھوں کی تعداد تک پہنچا ہوا ہے بلکہ ممالک دور دراز میں بھی ان کے ارادتمند کافی تعداد میں موجود ہیں۔ عرب شریف کے لوگ ان کو شیخ ہندی کہتے ہیں۔

میں جب ان کی زیارت کے لئے گاؤں میں داخل ہوا تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ بالاخانہ پر تشریف فرما ہیں، وہاں پہنچا تو چند زائرین ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے بتایا کہ آپ ابھی اندر آرام فرما ہیں، جب دروازہ کھلے گا تو زیارت ہوگی، چنانچہ میں بیٹھ گیا، آدھ گھنٹہ کے بعد دروازہ کھلا تو سب آدمی اندر حاضر ہوئے۔ آپ فرش پر قبلہ رو تشریف فرما تھے، پیچھے گاؤ تکیہ رکھا ہوا تھا، سلام کر کے سب لوگ بیٹھ گئے، اتنے میں آپ کا ایک خادم عبداللہ نامی چائے، بسکٹ اور رس وغیرہ لے کر آگیا، آپ نے چائے کی تین پیالیاں نوش فرمائیں اور اپنے پس خوردہ میں سے بعض خاص احباب کا نام لے کر ان کو تبرک کے طور پر عطا فرمایا اور دیگر زائرین کو چائے میں رس اور بسکٹ ڈال کر پلائی گئی۔

جس وقت میں حاضر ہوا، اس وقت جھنگ، لائل پور، گجرات، سیالکوٹ، گوجرانوالہ اور لاہور کے اضلاع کے لوگ زیارت کے لئے حاضر تھے۔ حضرت پیر صاحب نے میرے سامنے مندرجہ ذیل گفتگو فرمائی، بطور پند و نصائح فرمایا :۔

"سوالی کو دیکھ کر ناراض نہ ہونا چاہیئے، جو کچھ توفیق ہو دے دینا چاہیئے"

پھر فرمایا :۔

"چوگ بھی بڑی تے چڑیاں بھی بڑیاں"

یعنی چڑیوں کو جتنا دانہ ڈالو گے اتنی ہی چڑیاں زیادہ آئیں گی اور ان کے لئے دانہ بھی زیادہ ملتا رہے گا۔ اس مقولہ سے آپ کا مطلب یہ تھا کہ مخلوقِ خدا کی جتنی زیادہ خدمت کرو گے اور ان کو کھلاؤ گے اتنا ہی تم پر رجوعاتِ خلق زیادہ ہوگی اور تمہارے رزق میں اضافہ ہوگا۔

اور فرمایا :۔

"ضلع جالندھر میں ایک بزرگ تھے وہ اس مہینہ میں ختم و نیاز کیا کرتے

اور کھیر پکا کر چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں ڈال کر پرندوں کو کھلایا کرتے تھے، جب وہ فوت ہوئے تو ان کے بیٹے نے وہ رسم مٹا دی یعنی پرندوں کو کھانا کھلانا بند کر دیا چنانچہ وہ بزرگ ایک مرتبہ خواب میں اس کو ملے اور فرمایا بیٹا! تم نے میرے مہمانوں (پرندوں) کا روزینہ بند کر دیا ہے تمہارا روزینہ بھی بند ہو جائے گا، اگر تم فراخی چاہتے ہو تو میرے طریقے پر کاربند رہو، چنانچہ پھر اس نے پرندوں کو کھیر کھلانا شروع کر دی اور اس کی روزی فراخ ہو گئی۔

فرمایا ایک مرتبہ عرب شریف کے ایک بزرگ ہمارے ہاں مہمان رہے، روٹی کھانے کے بعد انہوں نے کوؤں کو ریزے ڈالے۔ پہلے دن ہم نے دیکھا پانچ کوے وہاں موجود تھے۔ دوسرے دن انہوں نے کوؤں کو پھر ریزے ڈالے تو ہم نے شمار کیا بیس کوے تھے۔ اسی طرح ہر روز کوؤں کو ریزے ڈالتے تھے اور ان کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ آخر جب ایک مہینہ کے بعد وہ رخصت ہوئے تو ہم کو بلا کر فرمایا جماعت علی شاہ! اس ہماری اولاد (کوؤں) کا خیال رکھنا، اس روز ہم نے شمار کیا تو کوؤں کی تعداد ڈیڑھ سو تھی۔

اور فرمایا اس سال جب ہم حج کرنے گئے ہیں تو عرب شریف میں بارش ہوئے تین سال گزر گئے تھے چنانچہ لوگوں نے ہمیں نمازِ استسقار کے لئے مجبور کیا، ہم نے نمازِ استسقار ادا کی اور دعا مانگی، خدا تعالیٰ کے فضل سے بارش شروع ہو گئی اور پانچ گھنٹہ تک متواتر موسلا دھار بارش ہوتی رہی اور ہر طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔

پھر معجزاتِ نبوی کا تذکرہ شروع ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ کافروں نے کھجور کی گٹھلی نکال کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں پیش کی اور کہا کہ اگر یہ اُگ پڑے تو ہم مانیں گے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ زمین میں گاڑ دی۔ خدا تعالیٰ کے حکم سے وہ کھجور بن گئی اور اس کے ساتھ جو کھجوریں لگیں وہ سب بے گٹھلی تھیں اور آج تک مدینہ طیبہ

میں وہ کھجوریں پائی جاتی ہیں جن میں گٹھلی نہیں ہوتی۔

اور فرمایا ایک مرتبہ کافروں نے جلی ہوئی ایک کھجور حضورِ نبوی میں پیش کی اور کہا اگر یہ اُگ پڑے تو ہم اسلام لے آئیں گے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ سے وہ بھی اُگ پڑی، اور آج تک مدینہ منورہ میں یہ کھجوریں بھی ملتی ہیں جو جلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

اس کے بعد ایک زرگر آپ کے واسطے ایک انگشتری بنا کر لے آیا جس کا نگین یمنی تھا، آپ نے لے کر ہاتھوں میں پہن لی۔

اسی طرح گفت وکلام کے بعد بعض لوگوں کو اجازت ہو گئی اور بعض کو نہ ہوئی، جن کو آپ اجازت دیتے تھے ان کو دو تین باتیں کہتے تھے، ایک تو نیچے کے کمرہ سے پیر حیدر شاہ سے تبرکات لیتے جاؤ، دوسرے مسجد کی زیارت کرتے جاؤ۔

اس کے بعد میں بھی حاضر ہوا اور کہا السلام علیکم، آپ نے مصافحہ کیا، میں نے دست بوسی کی اور مبلغ دو روپیہ بطور ہدیہ پیش کئے، آپ نے قبول فرمالئے اور پوچھا کون ہے؟ میں نے عرض کیا، میں گجرات، مقام ساہنپال شریف درگاہ عالیہ حضرت نوشہ گنج بخش سے آیا ہوں۔

فرمایا کس وقت آئے ہو؟

عرض کیا صبح سات بجے کی گاڑی پر آیا ہوں۔

فرمایا سویرے تو کوئی گاڑی گجرات کی طرف سے نہیں آتی۔

عرض کیا میں نارووال گیا ہوا تھا وہاں سے واپس ہو کر سویرے آیا ہوں۔

فرمایا اب تک چار گھنٹے کہاں رہے ہو؟

عرض کیا اسی کمرے میں بیٹھا تھا، چونکہ دوسرے لوگ گفتگو کر رہے تھے اس لئے میں خاموش بیٹھا رہا۔

عرض کیا ہاں جی ہے۔

فرمایا کس غرض کے لئے آئے ہو؟

عرض کیا کچھ عرصہ ہوا ہے آپ کی زیارت مجھ کو خواب میں ہوئی تھی کہ آپ حضرت نوشہ صاحب کی درگاہِ عالیہ سے پالکی نشین ہو کر ہمارے گاؤں کی طرف تشریف لا رہے ہیں، خلقت کا ہجوم کافی ہے۔ میں نے آپ کو سلام کیا، آپ نے مجھ کو ایک وظیفہ بتایا جس پر میں عمل کرتا رہا ہوں، اس روز سے مجھے زیارت کا اشتیاق تھا چنانچہ آج حاضر ہوا ہوں اور کسی وظیفہ کا بھی طالب ہوں۔

فرمایا خواب میں کیا وظیفہ بتایا تھا؟

عرض کیا نمازِ مغرب کے بعد ایک سو مرتبہ یاحي یا قیوم اور ہر ایک قمری مہینہ کے آخری عشرہ میں ایک روزہ وصوم۔

فرمایا آئندہ یہ وظیفہ بھی پڑھا کرو:۔

اول: نمازِ فجر سے پہلے یہ وظیفہ پڑھا کرو، درود شریف اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَسَلِّمْ تین مرتبہ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ایک مرتبہ، توبہ و استغفار اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَيْهِ ایک سو مرتبہ، پھر درود شریف تین مرتبہ۔

یہی وظیفہ بلا ناغہ بترتیب مذکور نمازِ عشاء کے بعد بھی پڑھا کرو۔

دوم: بدھ وار کی رات کو سونے کے وقت سر شمال کو ہو اور پاؤں جنوب کو اور منہ قبلہ کی طرف کر کے لیٹتے ہوئے درود شریف مذکور تین مرتبہ اور تعوذ ایک مرتبہ اور بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ایک سو مرتبہ۔ پھر درود شریف مذکور تین مرتبہ پڑھ کر سو رہو۔ اس وظیفہ کو بدھ وار کی رات کو شروع کرو اور پھر بلا ناغہ روزانہ

سونے کے وقت یہ پڑھا کرو۔

سوم: منگلوار کے دن نمازِ عصر کے بعد درود شریف مذکور ایک سو مرتبہ، تعوذ ایک مرتبہ، تسمیہ ایک مرتبہ، آیہ کریمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ پانچ سو مرتبہ، پھر درود شریف مذکور ایک سو مرتبہ پڑھا کرو، یہ وظیفہ صرف منگلوار کے دن کا ہے، روزانہ کا نہیں۔

بعد از اختتام اس کا ثواب بروح حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی بخش دیا کرو اور جو حاجت رکھتے ہو بتوسل خواجہ صاحب خدا تعالیٰ سے دعا مانگ لیا کرو اور اللہ تعالیٰ مشکلات حل کرے گا۔

پھر فرمایا یہ وظائف تمہیں دنیا و دین میں کفایت کریں گے، وللہ الحمد، پھر آپ نے سب حاضرین کو بھی ان وظائف کی اجازت دی اور سب نے قبول کی۔

پھر آپ نے فرمایا جاؤ پیر حیدر شاہ سے حرمین الشریفین زادہما اللہ شرفاً و تعظیماً، کے تبرکات حاصل کر لو اور مسجد کی زیارت کرتے جاؤ، چنانچہ میں وہاں سلام و دست بوسی کر کے رخصت ہوا، آگے ایک کمرہ میں آپ کے فرزند ثانی صاحبزادہ خادم حسین صاحب بیٹھے ہوئے تھے، ان کو بھی سلام کیا۔ پھر تبرکات لینے گیا تو وہ کمرہ بند تھا، میں نے زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ گاڑی کا وقت تھا۔ پھر میں نے مسجد کی زیارت کی۔ سنگِ مرمر کی عالیشان تیار ہوئی ہے اور ابھی جنوبی شمالی برآمدہ کے ستون کھڑے ہیں، اور اوپر عمارت تیار ہونے والی ہے، کافی سنگِ مرمر پڑا ہے، مسجد نہایت منقش و مزین ہے۔ ایک شہتیر بطور عجیبہ مچھلی کے کانٹے کا جنوبی دیواروں پر نصب ہے، فرش بھی نہایت دیدہ زیب اور قیمتی قالین بچھے ہوئے، خیر زیارت کرتا ہوا سیدھا اسٹیشن کو گیا، جاتے ہی ٹکٹ مل گیا اور گاڑی پر سوار ہوا۔ ریل میں ایک شخص ملا جو میرے بعد پیر صاحب علی پوری سے اجازت لے کر آیا تھا، اس نے کہا کہ مجھے تبرک حاصل کرنے میں

بقیہ صفحہ ۴۶ پر

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

۱۳۵۲ھ میں آپ (حضرت امیرملت قدس سرہ) کی مدینہ طیبہ میں حاضری ہوئی اور آپ علیحدہ نماز ادا کرتے تھے، پیچھے کئی صفیں عقیدت مند نمازیوں کی ہوتیں۔ یہ دیکھ کر امیر مدینہ نے حضور کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔ جرأتِ اقتدار اور نشہ حکومت سے سرشار ہو کر حضور سے بازپرس کی کہ تم کیوں ہمارے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے؟

حضور نے نہایت اطمینان اور سکونِ قلب اور فطری حق گوئی کے جذبہ سے اور بڑی جرأت سے جواب دیا کہ میں حنفی المذہب ہوں اور آپ غیر مقلد ہیں۔ میرا مذہب مجھے آپ کے امام کے پیچھے نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ میں یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں اپنی نمازوں کو سنوارنے کے لئے حاضر ہوا ہوں، گنوانے کے لئے نہیں۔

مردِ حق گو کی زبان سے یہ جواب سن کر امیر مدینہ سکتہ میں آگیا اور حیران تھا کہ بیشۂ حقیقت کے اس شیر ابن شیر کو کس طرح قابو کیا جائے مگر اس کا کوئی بس نہ چلا، آخر اس نے کہا کہ صرف آپ کو علیحدہ نماز پڑھنے کی اجازت ہو سکتی ہے مگر ہماری حکومت یہ کبھی برداشت نہ کرے گی کہ آپ دوسرے لوگوں کو اپنے ساتھ لیکر علیحدہ جماعت کرائیں اور نماز پڑھائیں۔

آپ نے فرمایا میں کسی کو کہتا نہیں ہوں کہ آؤ میرے پیچھے نماز پڑھو۔ میں جب نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو لوگ خود بخود میرے پیچھے نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، کیا میں انہیں اپنی نماز توڑ کر اپنے پیچھے نماز پڑھنے سے روکوں اور نماز سے اور وہ بھی جماعت والی نماز سے جو اہلِ سنت حنفی المذہب اہلِ سنت امام کی اقتدا میں پڑھ رہے ہوں، روکنا شریعت میں ممنوع اور حرام ہے، کفار کے حق میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے مناع للخیر،

... ہیں بمقتضیٰ تمہارے مومن ہوں بھلا ان کو کیسے رد کروں گا؟

اس جواب سے امیر مدینہ بہت سٹپٹایا اور کہا کہ آپ کو قید کر دیا جائے گا، حضور نے فرمایا آپ صاحب امر ہیں، اگر آپ کی شریعت اور آپ کا دین یہی تعلیم دیتا ہے تو آپ کو اختیار ہے مگر میں اپنے مذہب کے خلاف ایک بال کے برابر بھی ادھر ادھر نہیں ہونگا

ہوں لائقِ تعزیر یہ الزام ہے جھوٹا
مجرم تو ہوں بیشک یہ خطا اور ہی کچھ ہے

آپ کا جواب سن کر امیر اٹھ کر چلا گیا اور اس کے خادموں نے حضور سے کہا کہ آپ یہاں سے کہیں نہیں جا سکتے۔ آپ کو امیر کے آنے کا انتظار کرنا ہو گا، آپ تقریباً ایک گھنٹہ وہیں بیٹھے رہے ؎

مستحقِ دار کو حکمِ نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

حضور سے باز پرسی کی خبر مدینہ منورہ میں آگ کی طرح پھیل گئی اور دفترِ امیر کی طرف ہزاروں حجاج اور مدینہ منورہ کے شہری جانے لگے یہاں تک کہ وہاں ہزاروں انسانوں کا اجتماع ہو گیا جو حضرتِ امیرِ ملت کے فقط ایک اشارے پر اپنی جانوں تک کو قربان کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔

امیر نے اس اجتماعِ عظیم کو دیکھا تو وہ گھبرا گیا اور اس نے اسی میں اپنی خیر منائی کہ آپ کو باعزت رخصت کر دیا۔

دفترِ امیر سے واپسی کے بعد آپ کے چند مخلص دوستوں نے، نہیں نہیں بلکہ جاں نثار پروانوں نے عرض کی کہ حضور! اس گستاخ امیر کا معاملہ سلطان کے گوش گزار کر دیا جائے تو اچھا ہو گا تاکہ اس نابکار کو گستاخی کی سزا مل جائے۔

حضور نے حلم و بردباری اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کے پیشِ نظر مناسب

نہ جانا کہ میری وجہ سے مدینے کے رہنے والے کو کوئی سزا ہو۔ آپ نے فرمایا میں فقیر گنہگار ہندی اور وہ عربی اور امیر مدینہ، اگر مدینہ منورہ کا کتا بھی مجھے کاٹے تو میں اُف تک نہ کروں گا چہ جائیکہ امیر مدینہ کی شکایت سلطان کے پاس کروں ؎

میں نے سو گلشنِ جنت کو کیا اس پہ نثار
دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا

آپ نے فرمایا فقیر سلطانِ دنیا کی خدمت میں درخواست نہیں کرے گا، فقیر کے معاملہ اور حال کا علم رب العلمین کو ہے۔ سنا گیا ہے کہ اس واقعہ کے چند ماہ بعد وہ امیر کسی خطا پر نوکری سے معزول کر دیا گیا۔

حضور تقدس مآب نے دفتر امیر میں جس علو ہمتی، قوت ایمانی اور بلند ترین عزم کا اظہار کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے بعد جب آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور ایک دن جب آپ مغرب کی نماز ادا فرما چکے تھے، سلطانِ حجاز کے ایک مقرب مولوی محمد اسمٰعیل غزنوی صاحب آئے اور حضور کی خدمت میں بصد ادب و احترام عرض کیا کہ حضور! سلطانِ حجاز نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ آپ اس کے پاس تشریف لے چلیں، وہ آپ کی زیارت کا متمنی ہے اور آپ کے قدومِ میمنت لزوم کا منتظر ہے، آپ میرے ساتھ چلیں اور امیرِ مدینہ نے جو آپ کے ساتھ نامناسب اور ناشائستہ سلوک کیا ہے۔ آپ سلطان کے سامنے خود بیان فرمائیں تاکہ اس کو اس کی گستاخی کا مزہ چکھایا جائے۔

ہمارے آقا و مولا حضرتِ امیرِ ملت نے دربار میں جانے سے بے دھڑک انکار فرمایا، مولوی محمد اسمٰعیل غزنوی نے آپ کے وہاں جانے پر بے حد اصرار کیا مگر آپ نہ مانے اور فرمایا۔ مولوی جی! میرے معاملات اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں بادشاہانِ دنیا کے ساتھ نہیں، میں ہرگز فریادی بن کر بادشاہ کے پاس نہیں جاؤں گا۔

جناب مشتاق سنیاسی لاہوری (جناب ڈاکٹر عبد السلام خورشید کے ماموں) اور

جناب ڈاکٹر میر ہدایت اللہ امرتسری آپ کے ہم رکاب اور ہم قدم تھے، انہوں نے عرض کیا کہ حضور آپ کی ہستی تو بلند ترین ہے، یہاں کی ہر تکلیف کو آپ راحت سمجھتے ہیں مگر آپ کے غلاموں اور آپ کی اولاد کا کیا ہوگا حضور کے صاحبزادگان بلند اقبال اور ارباب خاندان کو روضۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر حاضری دیتے رہنا ہے، ان کے سامنے بھی یہی مشکلات آئیں گی، بہتر ہے کہ ان کا تدارک حضور ہی سے ہو جائے۔

ان کا مطلب تھا کہ سلطان ابن سعود سے مل کر اس بارے میں گفتگو کی جائے آپ نے انہیں بھی یہی کہا کہ حرم شریف میں نماز باجماعت کا فیصلہ بے شک ضروری ہے مگر میں اس کے لئے بادشاہ کے پاس فریادی بن کر نہیں جاؤں گا، میری فریاد تو اللہ پاک اور اس کے حبیب لولاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آگے ہے، علامہ اقبال مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے!
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

؎ پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
جب جھکا تو غیر کے آگے، نہ تن تیرا نہ من

مولوی اسمٰعیل غزنوی صاحب کو جب معلوم ہو گیا کہ آپ سلطان کے پاس نہیں جائیں گے تو اس نے کہا کہ بادشاہ کی مرضی ہے کہ پہلی جماعت شاہی امام ہی کرائے گا، جماعت ثانیہ کوئی بھی کرائے حکومت اس سے مانع نہیں ہو گی، اس کا اعلان آئندہ جمعہ تک ہو جائے گا۔

اس سے جملہ حاضرین خوش ہو گئے، دیکھ لیجئے! آخر بادشاہِ وقت ہی کو مردِ حق کے سامنے جھکنا پڑا، مردِ مومن کی توجہ اور نگاہ سے بھلا کیا نہیں ہو سکتا ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

آپ کی حق گوئی کا ایک یہ واقعہ بھی سنیئے - پہلی جنگ عظیم کے بعد ملک حجاز میں جب ترکان احرار کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور شریف حسین کی حکومت قائم ہو گئی - آپ شریف مکہ کے زمانے میں حج کیلئے جدہ سے گزر رہے تھے تو ہندوستانی قونصل مقیم جدہ کی ایک ضیافت میں شریک ہوئے - اس دعوت میں شریف علی شہزادہ سلطان شریف حسین جو اس وقت جدہ کا گورنر تھا وہ بھی شریک تھا، فرانس، انگلینڈ، ہالینڈ، مصر، ایران وغیرہ ممالک کے سفراء بھی شریک تھے، کھانا یورپ کے طریق کے مطابق میز پر چنا گیا، چھری کانٹے اور چمچے رکھے گئے -

سب نے انگریزوں کی طرح چھری کانٹے سے کھانا شروع کیا - آپ دستِ مبارک سے کھانے لگے تو گورنر جدہ نے ہندوستانی سفیر سے پوچھا کہ یہ بوڑھا کون ہے؟ کہ ہاتھ سے کھا رہا ہے - آپ نے سنا اور سفیر کے جواب دینے سے قبل عربی زبان میں فرمایا

" حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا شیدائی ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہی ہے کہ ہم مسلمان ہاتھ سے کھائیں "

اس جواب سے گورنر کے ہوش اڑ گئے، وہ اور سب دوسرے مسلمان اپنی غلطی پر سخت نادم اور شرمندہ اور اسی وقت سب نے چھری کانٹے پھینک دیئے اور ہاتھ سے کھانے لگے - ایک آن میں سب کو صحیح مسلمان بنا کر رکھ دیا، کون ہے جو آج میرے آقا کی مثال پیش کرے ع

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

(ماہنامہ انوار الصوفیہ، قصور، جولائی ۱۹۶۹ء)

نیل گڑھی کا مسافر

گل محمد فیضی ایم اے

لیلیٰ شب نصف فاصلہ طے کر چکی ہے، آسمان پر ستارے چمک رہے ہیں چاروں طرف ہُو کا عالم طاری ہے، ہر ذی روح محوِ خواب ہے مگر عباس خاں نیند سے کوسوں دور حیرت اور الجھن کے سمندر میں غوطہ زن ہے، ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ اس کی آنکھ لگ جائے مگر بے سود۔

عباس خاں ایک خواب دیکھ چکا ہے، کوئی غیبی آواز پکار پکار کر کہہ رہی ہے عباس خاں اٹھو اور شہر سے باہر ایک غریب الدیار مسافر اور بے یار و مددگار اجنبی کو اپنے ہاں لا کر پناہ دو، جسے شہر کے لوگوں نے تبلیغِ مذہبِ حقہ کے جرم کی پاداش میں طرح طرح کی اذیتیں دے کر شہر بدر کر دیا ہے۔

دسمبر کی قیامت خیز سردی، ہر سو تاریکی، نصف شب کا وقت اور جگہ سے عدمِ واقفیت رئیسِ شہر عباس خاں کے لئے پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے ادھر نیند ہے کہ ایسے گئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ، ناچار خیال آیا چلو اپنے کوچوان سے پوچھتے ہیں شاید عقدہ حل ہو جائے۔

ہاں ہاں! میں ان کو جانتا ہوں، میں ان کی غلامی کا طوق گلے میں ڈال چکا ہوں، میں ان کو اپنا رہبر و رہنما اور پیر و مرشد بنا چکا ہوں، وہ میرے کعبۂ ایمان ہیں، خانصاحب یہ الفاظ کوچوان نے عباس خاں کے سوال کے جواب میں کہے۔

خان صاحب! میرے پیر پنجاب کے رہنے والے ہیں اور ہزاروں میل کا سفر

طے کر کے تبلیغِ حق کی خاطر یہاں تشریف لائے ہیں کہ نیل گڑھی جیسے پسماندہ علاقوں میں نورِ ہدایت کی ضیا پاشی ہو لیکن یہاں کے جعلی پیروں نے اپنے کارندوں کے ذریعے مزاحمت کی اور بہت تکلیف پہنچائی ہے۔ یہ کہہ کر کوچوان زار و قطار رونے اور اشکوں کے ہار پرونے لگا۔

تھوڑی دیر بعد عباس خاں اور کوچوان شہر سے باہر اجنبی مردِ درویش کی خدمت میں حاضر ہیں۔ اجنبی عالمِ محویت میں خدا سے لَو لگائے بیٹھا ہے اور دعا کرتا ہے :

"اے اللہ! مجھے اپنی خوشنودی عطا فرما، مجھے دینِ متین کی خدمت زیادہ سے زیادہ کرنے کی ہمت عطا فرما۔ اس سلسلے میں اگر میری جان بھی جائے تو پرواہ نہیں کیونکہ ع

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حضور حضور! عباس خاں نے عرض کیا، اجنبی اچانک آواز اور دو متحرک سایوں کو دیکھ کر حیران ہوا اور بلند آواز سے کہا کون ہے؟ عباس خاں نے پُرنم آنکھوں اور کانپتی ہوئی آواز سے گزارش کی حضورِ والا! میں ایک ادنیٰ سا غلام ہوں، آپ کو لینے آیا ہوں تاکہ آپ جنگل اور سردی کی تکلیف سے نجات حاصل کر سکیں اور میرے غریب خانے پر قدوم میمنت لزوم فرمادیں۔

"کیوں اپنی جان کو مصیبت میں ڈالتا ہے، لوگ تمہارے بھی درپئے آزار ہو جائیں گے۔"

اجنبی نے کہا :

حضور! خواہ کچھ بھی ہو میں ضرور لے کر جاؤں گا۔"

چنانچہ تھوڑی دیر بعد عباس خاں کی کوٹھی پر اجنبی جلوہ افروز ہے، رشد و ہدایت کے چشمے پھوٹ رہے ہیں، ہزار ہا لوگ گمراہی سے نکل کر راہِ حق پر گامزن ہو چکے ہیں اور

مخالفین کی کشتیٔ مکر و فریب ساحل نامرادی و ناکامی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکی ہے۔
آج یہ اجنبی مسافر حضرت امیرِ ملت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری قدس سرہٗ
کے نام سے پنجاب کی سرزمین میں محوِ خواب ہے مگر اس کی جلائی ہوئی شمع ہندوستان
کے تاریک ترین گوشے نیل گڑھی کی پہاڑیوں سے اب بھی روشن ہے ؎

ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا
وہ مردِ درویش دیے تھے حق نے جسے اندازِ خسروانہ

— بقیہ صفحہ ۳۸

دیر ہو گئی ہے۔ میں نے کہا میں تو گاڑی کی جلدی سے تبرک نہیں لے سکا، اس نے اسی وقت
دو کھجوریں مجھ کو دے دیں اور وہ کمی بھی پوری ہو گئی چنانچہ میں پسرور اسٹیشن پر آ اترا۔
آپ کے یہ احوال ملاحظہ سے گزرے۔ آپ کی عمر سو سال سے زیادہ اور بقول بعض
احباب ایک سو بارہ سال ہے۔ آواز نوجوانوں کی طرح بارعب ہے، چہرہ سرخ و سفید،
داڑھی مبارک کو مہندی لگی ہوئی اور دراز ہے، سر کے بال مقرض اور خشخاشی۔ آپ نے
حرمین الشریفین کے اڑتالیس حج کئے ہیں بلکہ اس حج ۱۳۶۷ھ سے واپس آئے ابھی
چھ ہی روز گزرے ہیں، بہت امیر آدمی ہیں۔ لباس فاخرہ زیب تن کرتے ہیں۔ نسوار کا استعمال
بہت کرتے ہیں، دولتِ دنیوی اور سامانِ معیشت بھی کافی ہے، مخلوق کی رجوعات بہت
ہے، ہر ایک آدمی سے اس کا نام و مقام پوچھتے ہیں اور اس کے مذاق کے مطابق گفتگو
کرتے ہیں، جو کچھ کوئی نذرانہ دے وہ قبول کر لیتے ہیں، سلمہ اللہ تعالیٰ۔

قطعاتِ تاریخ وفاتِ امیرِ ملت

محمد صادق قصوری

حضرت امیر ملت قدس سرہ کی وفات حسرت آیات پر شاعروں نے ان گنت نظمیں اور ادیبوں نے لاتعداد مضامین لکھ کر بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔ متعدد رسائل نے خصوصی مضمون لکھ کر ان کی عظمت و بزرگی اور کارناموں کو اجاگر کیا۔ متعدد مادہ ہائے تاریخ وفات لکھے گئے وہ تمام اس دلی عقیدت اور احترام کے مظہر ہیں جو ملتِ اسلامیہ کو ان کی ذاتِ گرامی سے تھی۔ زیرِ نظر مضمون میں ہم اردو، فارسی اور عربی مادہ ہائے تاریخ رقم کر رہے ہیں:۔

اردو قطعاتِ تاریخ

(از حضرت مولانا ضیاء القادری رحمۃ اللہ علیہ)

امیرِ جماعت امیرِ حقیقی — جماعت علی شاہ پیرِ حقیقی
محدّث مفسّر مبلّغ مجدّد — ہر اک علم میں بے نظیرِ حقیقی
شریعت میں صدرِ صفِ اہلِ سنت — طریقت میں روشن ضمیرِ حقیقی
وہ جس کے رخِ حق نما سے عیاں تھی — ضیائے سراجِ منیرِ حقیقی
وہ لختِ دلِ حیدرہ و آلِ زہرا — وہ سید وہ جید وہ میرِ حقیقی
ہوئے وائے صد حیف واصل الی اللہ — مریدوں کے وہ دست گیرِ حقیقی

ضیا لکھئے مرحوم کا سالِ رحلت
جماعت علی شاہ پیرِ حقیقی
۱۳ھ ۷۰

دیگر

ہوئے واصل بحق وہ پیرِ طریق | تھا ولایت کا جن کی ذات پہ حصر
پرتوِ نور نقشبند کی شان | لکھ ضیا مہدیِ مشائخِ عصر

۱۳۷۰ھ

دیگر

جنت کو گئے شیخ عدیم المثال | فردوس انہیں بخشے خدائے متعال
کہتے ہیں ملک اہلِ طریقت سے ضیا | شیخ العرفا ہادیٔ محبوب ہے سال

۱۳۷۰ھ

دیگر

قبلہ برگزیدہ عالم نقشبندی علی پوری | مولانا پیر جماعت علی شاہ صاحب

۱۳۷۰ھ | ۱۳۷۰ھ

۲

از جناب مائل بنگلوری صاحب

عارفِ حق مرشدِ روشن ضمیر | پائے ہیں اب قربِ ربِ ذو الجلال
آہ شیخِ عصرِ موجودہ، گئے | کہدیا مائلؔ نے یہ سالِ وصال

۱۳۷۰ھ

دیگر

رہنمائے راہِ حق ذی مرتبہ صاحب کمال | شیخِ عصر و قطبِ دوراں مرشدِ روشن خیال
سید و شاہ جماعت حاجیِ ابنِ علی | نقشبندی عارفِ حق ذاکر و احسن خصال
چھوڑ کر دارِ فنا وہ جانبِ عقبیٰ گئے | آپکو حاصل ہوا ہے وصلِ ربِ ذو الجلال
جنکے دل ہوتے ہیں زندہ عشقِ ربِ پاک سے | رہتے ہیں دائم وہ زندہ نزدِ ربِ لم یزل
سینکڑوں مردہ دلوں کو آپنے زندہ کیا | آپکا رشد و ہدایت تھا یقیناً بے مثال
گو بظاہر دور ہیں لیکن ہیں باطن میں قریب | آپکا فیضانِ روحانی ہے بیشک لا زوال
سن کے مائلؔ سے خبر ابِ عالمِ ملکوت سے | پا گئے قربت خدا کی، کہدیا سالِ وصال

۱۳۷۰ھ

۳

جناب ڈاکٹر خالد حسن قادری ایم اے پی ایچ ڈی، استاذ شعبۂ اردو، لندن یونیورسٹی

روضۂ مقدسہ والانسب
۱۳ ھ ۷۰

واقفِ حقائق، قطب الاقطاب سید المرشدین
۱۳ ھ ۷۰

ولیٔ زمانہ فرزندِ ختم المرسلین
۱۹ ء ۵۱

قدس آستان مجدد، مجدد قرن الرابع عشر
۱۹ ھ ۵۱

کعبۂ زماں امیر الملت سید جماعت علی شاہ
۱۹ ء ۵۱

قبلۂ عالم سلام اللہ علیہ رضی اللہ عنہ، فداہ امی وابی
۱۹ ء ۵۱

قبلۂ جہاں ۳۰ اگست انیس سو اکیاون چھبیس ذی قعدہ
۱۹ ۵۱

تیرہ سو ستر حجازی
۱۳۷۰ھ

شب جمعۃ المبارک آہ امید
۱۳۷۰ھ

۴

از جناب مولانا غلام حسین قمر یزدانی صاحب بہوانہ ضلع سیالکوٹ

ثوابِ شبِ غم
۱۹ ء ۵۱

پاکبازِ پیرِ روشن ضمیر
۱۹ ء ۵۱

ولیٔ زمانہ قبلہ عالم علی پوری رضی اللہ عنہ
۱۹ ء ۵۱

دیگر

پیشوائے اولیائے کاملین — رہنمائے اتقیاء و سالکین
میرِ ملت، رہبرِ اربابِ دیں — خسروِ اقلیمِ عرفان و یقیں
بزمِ اخلاص و محبت کا وقار — آسمانِ عشق کے ماہِ مبیں
جب ہوئے رخصت وہ شیخِ محترم — دارِ فانی سے سوئے خلدِ بریں

یوں ہوا ہاتف قمرؔ سے ہمکلام
فی البدیہہ کہہ دو یہ تاریخ حسین

سالِ ترحیلِ امیرِ اتقیار
افتخارِ اولیا روشن جبیں
۱۹ ۵۱

دیگر

حضرتِ شاہِ جماعت مقتدر
تھی زبانِ پاک جن کی پُر اثر

جب کیا منشائے حق سے آپ نے
جانبِ خلدِ بریں عزمِ سفر

فی البدیہہ کہہ دو یہ تاریخ وصال
عازمِ خلدِ بریں نیکو سیر
۱۳

زاہدِ پاک افتخارِ اولیار
سالِ رحلت ہے بعنوانِ دگر

اے قمرؔ ممتاز شد سالِ وفات
۱۳۷۰ھ
از وصالِ سیدِ والا گہر

دیگر

زبانِ پاک تھی جن کی خدا کے ذکر میں شاغل
جو تھے شرعِ محمد مصطفےٰ کے حامل و عامل

وہ سلطان المشائخ صدرِ بزمِ نقشبندیت
وہ درویشِ حق آگاہ جب ہوئے اللہ سے واصل

حیاتِ شہِ جماعت پاکدامن تھی بحمد اللہ
جسے اللہ سے ہر نعمتِ موعود تھی حاصل
۱۱۸

پئے سالِ وفاتِ میرِ ملت ہاتفِ غیبی
پکارا صاحبِ کشف و کرامت سالکِ کامل
۱۳ ۵ ۷۰

دیگر

بروزِ جمعہ ہوا جامِ زندگی لبریز
۱۱۸
تھی ان کی ذاتِ مقدس دراصل قابلِ خلد

قمرؔ بتاؤں یہ تاریخ حسرت و اندوہ
ہوئے ہیں آج وہ عالی صفات داخلِ خلد

۱۹۵۱ء ۱۹۵۱ء

دیگر

ظہورِ آلِ علیؓ ہے سنِ ولادتِ شہ
سنِ ولادتِ شیریں لقا کا کیا کہنا

۵۲ ۱۲ھ ۱۲ ۵۲ ھ

عیاں ہے لفظِ حسن سے حیاتِ پاک انکی
شہِ جماعتِ اہلِ صفا کا کیا کہنا

۱۱۸

سنِ وصال ہے روشن خیالِ خلد مکیں
امیرِ قافلۂ اتقیاء کا کیا کہنا

۵۱ ۱۹ ء

دیگر

صورت بھی بے مثال جماعت علی کی ہے
سیرت بھی باکمال جماعت علی کی ہے

عالی صفات داخلِ خلد اسے قمر حزیں
تاریخِ ارتحال جماعت علی کی ہے

۱۹۵۱ء

دیگر

امام الشیخ جماعت علی شاہ
مبلغ، مفسر، محدث، مجدد

قمرؔ سوئے فردوس جب وہ سدھارے
تو ہاتف پکارا تہِ خاکِ مرقد

۱۳۷۰ھ

دیگر

ہوئے عازمِ خلد شاہِ جماعت
ہیں محزون و مغموم اہلِ عقیدت

کہو باادب اے قمرؔ فی البدیہ تم
فضیلت مآب ان کی تاریخِ رحلت

۷ + ۱۳۶۳ = ۱۳۷۰ھ

۵

ازجناب ابوالطاہر فدا حسین فداؔ مدیر "اعلیٰ" مہر و ماہ لاہور

ہیں ناگہاں ہوئے رخصت جہانِ زار سے وہ
کہ باز جن کے لئے آج بابِ جنت ہے

نوٹ:- یاد رہے کہ حضور قبلۂ عالم علیہ الرحمۃ کی عمر مبارک ۱۱۸ سال تھی اس لئے "پاک" کے بحساب ابجد "حسن" کے اعداد میں ان کی طرف اشارہ ہے (قمر یزدانی)

ضیائے شمعِ رسالت کے تھے وہ پروانے — ملائکہ کے دلوں میں بھی ان کی عظمت ہے
رہے وہ بادۂ عشقِ نبیؐ سے مست مدام — رسول پاکؐ کی ان پر نگاہِ الفت ہے
تھے زہد و تقویٰ میں اکمل وہ شرعِ دیں کے نقیب — جبھی تو نور سے معمور ان کی تربت ہے
ہے ان کی چشمِ خدا بیں کا یہ تصرف اک — جہانِ فقر میں جاری بہم طریقت ہے
تھے شیخ و حافظ و حاجی بھی اور محدث بھی — لقب شیوخ میں ان کا امیرِ ملت ہے

سروشِ غیب نے ان کا سنِ وصال فدا
کہا امیرِ مکرم شہِ جماعت ہے
۷۰ ے ۱۳

فارسی قطعاتِ تاریخ

۱

از جناب مولانا ضیاء القادری رحمۃ اللہ علیہ

چوں پس ابرِ فنا آں مہرِ عرفاں شد غروب — رونما شد در جہاں تاریکیِ حزن و ملال
ہاتف از من در غمِ آں قبلہ با سوز و گداز — شمسِ عالم رحمۃ اللہ علیہ، گفت سال
۷۰ ۱۳ ھ

دیگر

چوں از جہاں راہی شد آہ — پیرِ جماعت حق آگاہ
سالِ وصالش گفت ضیاؔ — زاہد و عارف ظلِ اللہ
۷۰ ھ ۱۳

دیگر

آں جماعت علی کہ در حقِ او — اہلِ دیں مرشدِ گرامی گفت
اے ضیاؔ سالِ رحلتِ آں شیخ — پیرِ اعظم ولیِ نامی، گفت
۷۰ ھ ۱۳

حضرتِ مکرم قطبِ انام
۱۳

شیدائے اسمائے خیر الانام
۱۳

درویشِ ذی علم	شیخِ حق آشنا	وارثِ محبوبِ خدا	ملک الاولیاء رضی اللہ عنہ
۱۳ھ۷۰	۱۳ھ۷۰	۱۳ھ۷۰	۱۳ھ۷۰

۲

از جناب ماسٹر کرم الٰہی صاحب ایڈووکیٹ سیالکوٹ وخلیفہ مجاز امیرِ ملت قدس سرہ

او پیرِ علی پور پیرِ جہاں — ہمہ نور بخش و ہمہ نورِ جاں
جہاں سر بسر زیرِ احسانِ او — ہمہ مومناں زیرِ فرمانِ او
حبیبِ رسول و حبیبِ خُدا — مطاعِ جہاں بود و مشکل کشا
او بحرِ سخا بود و ابرِ کرم — کسے از درِ او نہ رفتہ دژم
درش قبلۂ اہلِ ایمان را — رخش کعبۂ اہلِ ایقان را
جہاں را چہاں نورِ ایمان داد — غلاماں را نورِ عرفان را
جہاں روشن از نورِ انوارِ او — یقیں محکم از شہدِ گفتارِ او
کمر بست و سوئے جناں شد رواں — ہمہ خادماں آہ و گریہ کناں

زسالِ وصالش چو کردم صدا
بگفتا بگو شیخِ حق آشنا
۱۳ھ۷۰

۳

از جناب سید محی الدین گلشن حیدر آبادی، حیدر آباد دکن

چراغِ دینِ محمدی	چراغِ اولیائے حق	چراغِ کعبۂ دو جہاں
۱۳ھ۷۰	۱۳ھ۷۰	۱۳ھ۷۰

۴

از جناب پروفیسر قریشی احمد حسین احمد قلعداری، گجرات

اے دریغا رفت از ما منبعِ صدق و صفا   معدنِ جود و صداقت مخزنِ مہر و وفا
حاجیٔ حرمین و حافظ سیدِ گردوں جناب   رہنمائے عارفاں ہم پیشوائے اولیاء
عارف و میرِ شریعت حامیٔ دینِ متیں   سالک و پیرِ طریقت صوفیٔ حق آشنا
شہ سوارِ حلقۂ عرفان و شاہِ ملکِ دیں   ہم سریر آرائے ملکِ علم و فضل و اتقاء
بود نور و روشن بعالم شمعِ دینِ معرفت   رفت از ما آں سراجِ حکمت و نورِ ہُدا
عمرِ شاں بگذشت بس در آمد و رفتِ حجاز   بود شاں را ایں تمنا و درود درِ جنابِ مصطفٰے
آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں   بر وفاتِ ایں چنیں پیر و امیرِ اولیاء
سالہا خواہد بنالد احمدِ خستہ دروں   از برائے ایں چنیں فقدانِ مردانِ خدا
چوں بروں اندوہ آمد گفت سالش عقلِ کل   ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما

۱۴۳۶ – ۶۶ = ۱۳۷۰ھ

گفت سالِ عیسوی از ہر دو ایں امیدِ فت

گنج بخشِ فیضِ عالم منظہرِ نورِ خدا

۲۰۰۴ – ۵۵ = ۱۹۵۱ء   ۲۰۰۴ – ۵۵ = ۱۹۵۱ء

۵

از جناب سید محمد حسین ظفر سکھو چکی، نشاط آباد فیصل آباد

چشمِ دنیا چراست گریہ کناں   از غمِ کیست چاک جیبِ جہاں
شورِ ماتم چراست در ہر جا   بے قرار است قلبِ ہر انساں
گشت ویراں گلشنِ آفاق   شد پریشاں سنبل و ریحاں
چشم وا مانده نرگس از حیرت   سرو استاده با دلِ حیراں

امیرِ ملت جماعت علی ہادیٔ خلق و مرشدِ دوراں
قدوۂ عارفان فی الدرجات شبلیٔ وقت بایزیدِ زماں
فخرِ صلحاء و سید السادات بحرِ عرفاں ہادیٔ دوراں
کرد پرواز بلبلِ روحش شد ز روحش بسوئے باغِ جناں
بود ہمچو جنابِ جدِ امجد مونسِ بیکساں و خستہ دلاں
از دہاں مے فشاند برگِ گل چوں نمودے تلاوتِ قرآں
وعظ گفتے چو از کلام اللہ بحرِ توحید سے نمود رواں
سید ہادی حبیب پیغمبر ہست تاریخِ آں ولی زماں

۷۰ ھ ۱۳

٦

از جناب حضرت شریف احمد شرافت نوشاہی، سجادہ نشین ساہنپال شریف

زہے ذاتِ والائے قطبِ زماں درو نورِ ذاتِ الٰہی نہاں
بزہد و تقا کاملِ وقت بود ز اقرانِ خود گوئے سبقت ربود
بہ فقہ و تصوف مقامش بلند بزہد و ریاضت شدہ مستمند
مفسر محدث بوجہ کمال بہ تذکیر و وعظ آمدہ بے مثال
فیوضش بعالم شدہ منتشر کراماتِ وے در جہاں مشتہر
مرخص شدہ زیں سرائے فنا نمودند او را بہ فردوس جا
شرافت بگفتا ز ترحیلِ فرد
جماعت علی شاہ پروانہ کرد

۷۰ ھ ۱۹

۷

از جناب پیر غلام دستگیر نامی رحمۃ اللہ علیہ

دین پناہِ علی پور جماعت علی شاہ

۱۳ ھ ۷۰

۸

از پروفیسر حامد حسن قادری رحمۃ اللہ علیہ

نمودِ قیامتِ صغریٰ

۱۹ ء ۵۱

عربی قطعاتِ تاریخ

از پروفیسر حامد حسن قادری

ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک

۱۳ ھ ۷۰